"اندھیرا پگ"
ثروت خان

''اندھیرا پگ'' ثروت خان کی پہلی
ناول ہے اور اس قدر کامیاب کہ اُن کی تخلیقی
صلاحیت کا لوہا منواتی ہے۔ ناول کے موضوع
میں کوئی نیا پن نہیں ہے بلکہ یوں کہئے کہ ہماری
سنسکرتی کے تناظر میں ہزاروں سال پرانا ہے
یعنی ہمارے سماج میں بیوہ عورت کی دُردشا۔
لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ تہذیب ہی کا
راجستھانی تناظر لے کر ثروت خان نے اس
پارینہ موضوع کو ایک ایسی تازہ کار تھیم میں بدل
دیا ہے جس میں بیوہ کی بپتا تانیثی بغاوت میں
بدل جاتی ہے۔ بیوہ کی بپتا کے بیان میں
راجستھان کے پروہتوں کی حویلیوں کا نقشہ
نازیوں کے کیمپوں کی یاد دلاتا ہے۔۔ اس فرق
کے ساتھ کہ نازیوں کا ظلم دشمنوں کا تھا اور نفرت
کے جذبہ کے تحت تھا جبکہ بیوہ بیٹی پر ظلم اپنوں کا
تھا اور سماجی مجبوری اور رسم رواج کی غلامانہ
پابندی کے سبب تھا۔ ہندوستان میں چونکہ ہوائی
جہاز اور بیل گاڑی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس لیے
ماڈرنزم اور قدامت پرستی کا بھی یہاں چولی
دامن کا ساتھ ہے۔ جو باتیں گئے گزرے زمانہ
کی لگتی ہیں انہیں ہمارے گردوپیش میں ناک کے
نیچے دیکھا جاسکتا ہے۔ شوہر آج بھی مرتے ہیں
اور عورتیں بیوہ ہوتی ہیں اور شاندار حویلی ایک
تنگ تاریک سیلن زدہ بدبودار چاروں طرف سے
بند کوٹھری میں سر منڈا کر بدرنگ ساڑی میں تحتہ

(ناول)

ثروت خان

ANDHERA - PAG (Novel)

by:

SARWAT KHAN

2005

Rs. 150

74، او، ٹی، سی اسکیم

چرک ہاسٹل کے پیچھے

سینٹرل اکیڈمی روڈ، ملا تلائی

اودے پور (راج)

فون: 2431121, 9414161121

سن اشاعت: ۲۰۰۵ء

تعداد اشاعت: ۵۰۰

قیمت: ایک سو پچاس روپے

مطبع: اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

معیار پبلی کیشنز

کے۔۳۰۲ر تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱

''انتساب''

ڈاکٹر رشید جہاں کے نام

علم وعمل کی جرأت مند خاتون

کہ

جس کی تحریر نے

تحریک کا روپ لے لیا۔

--

ایک صدی مکمل ہونے پر

راجستھان کا

نذرانہ

ثروت خان

مختصر سوانحی خاکہ

نام	:	ثروت النساء
قلمی نام	:	ثروت خان
جائے پیدائش	:	جھالاواڑ (راج)
وطن	:	ٹونک
رہائش	:	اودے پور
تعلیم	:	ایم۔اے،ایم۔فل، پی۔ایچ۔ڈی (اردو)
پیشہ	:	درس وتدریس (کالج)
افسانوی مجموعہ	:	ذرّوں کی حرارت (۲۰۰۴ء)
مشغلے	:	کتب بینی،ادبی سرگرمیوں میں شرکت، سوشل ورک (خصوصاً دیہات میں)۔

"گفتگو! آپ سے"

زندگی کی تب و تابش میں حقیقتوں کے انکشافات کا بڑا عمل دخل ہوا کرتا ہے۔ وہ حقیقتیں، جو آپ میں ہیجان پیدا کر دیں، وہ حالات، جو آپ میں تلاطم برپا کر دیں، وہ انکشافات، جو احساسات و جذبات کے دھاروں کو سرے سے موڑ دیں۔۔۔ تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔

اس ناول کو، تحریری شکل دینے سے قبل، میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہُوا۔۔ جب میں جیسلمیر گئی۔۔ وہاں کے کلچر، تہذیبی اقدار اور ثقافتی نظام سے متاثر ہوئی۔۔ جب میں بیکانیر گئی، جب میں جودھپور گئی۔۔ اتنا کچھ، اتنے قریب سے دیکھا کہ گویا ایک ایک کردار، ایک ایک واقعہ، ایک ایک مکالمہ سے میری پہچان ہو رہی ہو۔ ملاقات ہو رہی ہو۔ اُن کے رہن سہن، طور طریقے، رسم و رواج، سماجی و تہذیبی اُمور اور اُن کے اصول و ضوابط کی پاسداری میں کوشاں افراد۔۔۔ کو اپنے اِردگرد دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔۔ لگا۔۔ تبدیلی ہے کہاں؟۔۔ یہ کس چڑیا کا نام ہے۔ ہم مغالطہ میں ہیں کہ ہندوستان اکیسویں صدی میں دنیا کے نقشے پر ایک رہنما بن کر اُبھرنے والا ہے۔۔ ہاں مُٹھی بھر روشنی پر ہم اِترا سکتے ہیں۔۔ لیکن سواری تو ہمیں بیل گاڑی کی ہی پسند ہے۔ کھڑ کھڑ کرتی، پیّاں پیّاں چلتی۔۔ رینگتے رِنگاتے، دھچکے کھاتے اس سفر کی لگام، اب بھی فاشسٹ طاقتوں کے ہاتھ میں ہے۔۔ یہ ایسا مضبوط گڑھ ہے، جسے تسخیر کرنا۔۔ اچھے اچھوں کے بس کا نہیں۔۔ نہ جانے کب سے چلا آتا ہے یہ سَیلِ رواں۔۔ ہندوستانی تہذیب و کلچر کی دُہائی دیتا یہ نظام۔۔ کہ جس کو بدلنے کی سعی کی بھی جائے تو، مخالفت میں گھر کا بچہ بچہ بپھر کر ظلمتوں کے گھیرے میں آپ کو اس طرح

قید کر دے گا کہ آپ بے بس و بے عملی کے بھنور میں پھنس کر زندگی کو صدیوں پُرانے دقیانوسی نظام کے ہتھے منڈتے چلے جائیں گے جہاں آپ کو روشنی دکھائی دے گی، نہ ترقی۔۔آنے والے کئی سو سال تک اس سراب کو حاصل کرنے کی خواہش میں آپ، اپنے آپ کو صرف کرتے چلے جائیں گے۔۔بَس یہی ہمارا آج ہے۔۔جو کل بھی تھا اور کل بھی ہوگا۔

راجستھان رنگ رنگیلی تہذیب کا مرکز کہلاتا ہے۔کہ جہاں ایک طرف "Palace on wheel" میں آپ کو رجواڑی شان وشوکت میں ڈوبا ہوا عیش پَروسا جاتا ہے۔ وہیں دوسری طرف، اس شان وشوکت کے طفیل میں زندگی کے ''کٹھور دھراتل'' پر رینگتی، سِسکتی۔۔رواجوں، وراثتوں کو گلے لگاتی۔۔سفاک حقیقتوں سے رُوبرُو ہونے کا بھی موقع ملتا ہے، بشرطیکہ اس کے دیہات تک رسائی کی جائے۔

آیئے، میرے ساتھ۔۔اور جھانکیئے کچھ ایسے ہی مختلف shades کے اندرون میں۔۔خاکسار نے، راجستھان کو قریب سے دیکھنے اور دکھانے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔اس کوشش میں میرے تخیل اور پروازِ فکر کی آبیاری میں جو عوامل کارفرما رہے اُن میں بطورِ خاص، میں شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں Desert culture centre Jaisalmer کے روحِ رواں راشٹرپتی ایوارڈ یافتہ، جناب نند کشور شرما صاحب کا کہ جنہوں نے ایک ماہ تک مجھے نہ صرف اپنے سینٹر میں مفت داخلہ دیا بلکہ میرے جُنونی سوالات کے جوابات، بڑے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ دیئے مجھے بہت سا مارواڑی لٹریچر بھی فراہم کیا۔۔میوزیم کی ایک ایک چیز کو تالے کھول کر دکھایا۔۔اور وہ بہت کچھ بتایا۔۔جس سے اس ناول کے پلاٹ کی تشکیل میں مدد ملی۔۔اِسی سینٹر کے ایک employ امام الدین مانگڑیا۔کا بھی شکریہ

ادا کرنا ہے، کہ اُس نے بھی مجھے اپنے گھر لے جا کر۔۔ بوڑھی تائی، گنجی پھونسی بڑھیا، سُبھدرا رانی اور رینوؔ سے رُوبرو کیا۔ اُس کے گھر کے افراد سے مل کر، باتیں کر کے، مجھے محسوس ہوا کہ، میں اِن تمام کرداروں سے مکالمہ کر رہی ہوں۔۔ اور اسی کے دوران، اُن وراثتوں اور روایتوں سے بھی آشنائی ہوئی۔۔ جو اس ناول کا محرّک بنیں۔

جودھپور سے جے پور کے ایک یادگار سفر میں اجنبی سے دوست بنی۔۔ بیکانیر کی محترمہ وجے لکشمی صاحبہ کو میں بھلائے نہیں بھول سکتی۔۔ کہ وہ مجھے روپّی کی پھوپی۔۔ راج کنور کے جیتے جاگتے کردار کے رُوپ میں نظر آئیں۔۔ وہی سراپا، وہی عمل۔۔ اور وہی تیور۔۔ بس۔۔ یہی وہ عناصر ہیں۔۔ جن کی کارفرمائی ناول کی تحریک و تکمیل میں معاون ثابت ہوئی۔

امید ہے یہ کاوش آپ کے معیار پر کھری اُترے گی۔ شکریہ!

ثروت خان

۲۱ر جولائی ۲۰۰۵ء

بُلبُل بنَالُ و نالۂ پُر سوز و ساز کُن
دَر فکرِ آں مُباش کہ نہ شنید یا شنید

(باب۔۱)

چاندڑے.....اندھیرا یگ.....چاندڑے..... اندھیرا یگ.....ہونہہ..... یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ راج کنور نے بڑبڑاتے ہوئے آخری کروٹ لی۔ پھر سیدھی ہوئیں، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسایا۔ چڑ، چڑ، چڑ..... جسم کو آخری بل دے کر، بھرپور انگڑائی لی اور نرم ملائم بستر کو چھوڑ کر جسم سمیٹا اور کھڑی ہوگئیں۔

کشادہ کمرہ، زیرو واٹ کے بلب کی مدّھم روشنی سے نہایا ہوا تھا۔ دیوار پر مونا لیسا مسکرا رہی تھیں۔ راج کنور نے تصویر کو دیکھا، زیرِ لب پھیکا پن بکھرتا چلا گیا۔ نہ جانے کیا بڑبڑائیں اور ایک گہری سانس کے ساتھ بہت کچھ اندر باہر کرنا چاہتی تھیں کہ اچانک سانس روک لی اور آہستگی سے باہر نکالی کہ اتنے میں بیار کا شور کھڑکیوں کے کیواڑوں سے ٹکرا کر کمرہ کی سُرخی میں سرگوشیاں کرتا، تحلیل ہوگیا۔ گویا اپنا وجود ہی گنوا بیٹھا ہو۔۔ دور کہیں گیدڑوں کی آوازیں، گلی کے کتوں کا رونا اور بلّی کی غرّاہٹ۔۔ رات کی تاریک فضا میں، ان آوازوں سے حویلی کی پھنگیں تھرتھرا اٹھتی تھیں۔ فرحت بخش فضا، حویلی کے در و دیوار سے سر پھوڑ کر، ڈیوڑھی میں بنی اُس کوٹھری میں جا کر قید ہوگئی تھی۔ کمرہ میں ٹِک ٹِک کی آواز پر راج کنور نے کان لگائے۔ نظریں سوئی پر جم گئیں۔ رات کے ڈھائی بجے تھے۔ سائڈ ٹیبل پر رکھے کانچ کے سنہرے جگ سے، گلاس میں پانی انڈیلا، بس دو تین گھونٹ بھر۔۔ اُسے ہاتھ میں لے کر گولائی سے ہتھیلی اور انگلیوں کے درمیان گُھماتے گُھماتے اُس میں جھانکا تو آنکھوں کی پُتلیاں پھیلتی ہی چلی گئیں۔۔۔ پیشانی پر کئی موجیں اُبھر آئیں۔۔ چھوٹی بڑی رگوں میں دوڑتے لہو نے، اپنی فطری رَوِش چھوڑ کر، جسم کو سانسوں کی نشیب و فراز کے حوالے کردیا۔۔۔ اوہ ! یہ بوسیدہ گندی کوٹھری۔۔۔ یہ لالٹین کی تھرتھراتی لو۔۔۔ بان کی چٹائی اور اُس پر میلی گدڑی میں لپٹا، سمٹا، حسین مجسمہ۔۔۔ بالکل ساکت۔۔۔ ہاں! مجسمہ

ساکت ہی تو ہوتا ہے۔۔۔ بالکل ساکت !!

انہوں نے گھبرا کر گلاس کو ٹیبل پر دے مارا۔ چھناکے کی آواز نے کمرہ میں ہی دم توڑ دیا۔ اُسی کیفیت میں اُٹھیں اور کمرہ کی بالکنی کا دروازہ کھول کر باہر آگئیں۔۔۔ گہری گہری سانس لینے لگیں۔۔۔ انہوں نے محسوس کیا۔۔۔ چاندنی کی نرم سفید چادر میں ملبُوس کائنات۔۔۔ پَری پیکر بنی، اِتراتی، شرماتی خراماں خراماں آگے بڑھ رہی ہے۔۔۔ صادق کو وَرمالا پہنانے کی گھڑی جو آنے والی ہے۔ اس پَری پیکر کے قدموں میں تارے جھلملا رہے ہیں، پُروائی ہوا نے خیر مقدم کے لئے پَروں کو پھیلا دیا ہے۔ وہ اُڑتی اُڑاتی جب گیلری میں رکھے شاداب گملوں کے پاس سے گزری تو، پودوں کی ٹہنیاں جھوم اُٹھیں۔۔۔ اور لہرا کر راج کنور کی پنڈلیوں سے ٹکرائیں۔۔۔ گویا انہیں بھی اس مدماتی فضا میں شریک ہونے کی دعوت دے رہی ہوں۔۔۔ راج کنور نے اب سانسوں پر قابو پالیا تھا، اور چند لمحوں کے لئے ہی سہی، وہ اس فضا کا حصہ بننے کے لئے تیار ہوگئیں۔۔۔ وہ جھکیں اور نرم تبسم سے ٹہنی میں لگے پھولوں کو ہاتھوں کے پوروں سے سہلانے لگیں۔۔۔ ایک پل میں اُن کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم ہوگیا، جس کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ وہ اُن پھولوں کو سہلاتے سہلاتے فضا کے پُر بہار جھونکوں کے ساتھ بہتی چلی گئیں۔۔۔

یہ مہکتے پھول، یہ اَدھ کھلے غنچے۔۔۔ مُسکراتے، لہلہاتے ان پھولوں کو ان کے مکیں چھونے اور توڑنے دیں بھی یا نہیں۔۔۔ یہ سب کچھ منحصر ہے، اُن کی رَضا پر۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ ان خوشبوؤں کا رشتہ و ناطہ دل و دماغ سے اس طرح منسلک رہتا ہے کہ۔۔۔ انہیں روک پانا، اِن کی راہیں مسدُود کر دینا۔۔۔ کسی آلودگی کی باندھی ہوئی سرحدوں کی بندشوں کی دسترس میں نہیں۔۔۔ انہیں سرحدوں کو توڑتی، اس کائنات کی رگ رگ میں سماتی یہ نرم رَو بیار اور اس کے خوشگوار جھونکے۔۔۔ جب سمندر کے ہمراہ آسمانوں تک کا سفر طے کرتے ہیں تو، صرف اس لئے کہ انہیں زمین کے ریزے ریزے میں سما جانا ہوتا ہے۔۔۔ پانی کی ایک ایک بوند۔۔۔ جو اجنبی و

شناسا اور تپتی بنجر دھرتی کو صرف اس لئے شاداب کرتی ہے کہ اُسے نمو دے کر مخلوطی تہذیب کی تشکیل کر سکے --- یہ کائنات اور اس کا نظام --- یہ پانی --- یہ ہوا --- یہ سورج --- یہ آسمان --- سب بے حد منظم --- لیکن اس کا محور --- اس کا مرکز --- یہ انسان --- نہ جانے کیوں برہم برہم سا --- ہمیشہ درہمی برہمی پر ہی کیوں آمادہ رہتا ہے --- !!! نہ جانے کیوں --- کیوں --- کیو --- ں --- ں؟

''بُوا ---بُوا سا --- بُوا سا''۔ ''کیا کرتی ہے روپی ۔چھوڑ۔ میرا گلا گھٹ رہا ہے۔ باہیں ڈھیلی ہوگئیں۔ لیکن وہ چہکتی رہی --- ''بُوا سا''! ''ہاں ہاں کہہ تو۔ آگے بھی بڑھے گی یا بُوا سا بُوا سا ہی کرتی رہے گی''۔ ''بُوا سا! آج اسکول میں مجھے آل راؤنڈ بیسٹ پرفارمینس کا ایوارڈ ملا ہے'' --- یہ کہہ، وہ اُسی طرح چہکتے ہوئے اپنی پھپھی سے الگ ہوئی اور ہرنی کی سی چوکڑی بھرتی غائب ہوگئی۔ لیکن دوسرے ہی پل بدستور اچھلتے کودتے اپنے کمرہ میں سے چمچماتی ٹرافی لاکر راج کنور کے سامنے رکھ دی۔ وہ کچھ سمجھ پاتیں کہ کھنکتی آواز میں بولی۔

''بُوا آپ کو معلوم ہے --- آپ کو کچھ نہیں معلوم --- سنیئے سنیئے تو بُوا۔ میں ڈانس میں فرسٹ آئی --- ڈبیٹ میں فرسٹ آئی۔ بیسٹ اتھلٹ چُنی گئی اور اس سال این۔سی۔سی۔ میں آر۔ڈی۔ پریڈ کے لئے میرا نام سلیکٹ ہوا ہے --- دیکھو یہ ٹرافی --- اُس نے بڑے ہی انوکھے اور دلنشیں انداز سے اپنی بات مکمل کر کے مخروطی انگلی سے ٹرافی کی طرف اشارہ کیا۔

راج نے بڑی شفقت سے بھتیجی کو نہارا --- اور پھر مصنوعی انداز میں منہ پھلاتے ہوئے کہا۔ ''اور پڑھائی میں ---؟ ابھی جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ روپی نے بات کاٹتے ہوئے پھوپی کے مصنوعی غصہ سے بنی سوالیہ نشان آنکھوں کو پڑھ کر پہلے تو ٹرافی کو احتیاط سے پاس رکھی میز پر رکھا پھر دونوں ہاتھوں میں پھوپی کا چہرہ لے کر، ڈب ڈب کرتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بڑے رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی --- ''یہ پڑھائی کس چڑیا کا نام ہے --- میں تو جانتی ہی نہیں ---؟ بس پھر کیا تھا۔ راج کنور نے بھی اُسی سرگوشی والے انداز میں ہو بہو بھتیجی کی نقل

اُتارتے ہوئے کہا۔۔ یہ اِس چڑیا کا نام ہے''۔۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے روپی کا کان پکڑ کر مروڑنا چاہا ہی تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو صاف بچاتے ہوئے بھرپور اعتماد کے ساتھ انگوٹھے سے نازک انگلی کو ملا کر ہوا میں لہرایا اور۔۔۔ زور سے دبایا۔۔۔ مہین سریلی سی چٹکی بجی۔۔۔ چٹ۔۔۔ اور اسی کے ساتھ ہوا میں گونجا۔۔۔ دم خم والا لہجہ۔۔۔''اُس میں بھی ٹاپ''۔ روپی نے ٹاپ پر اتنا زور دیا کہ کشادہ کمرہ کی اونچی چھت سے آواز ٹکرا کر گونج اٹھی۔

''ارے میری بچی، میری بٹو''۔ اور پاس بیٹھی بھاوج سے مخاطب ہوئیں جو ایک ٹک یہ نظارہ بڑی شفقت و محبت سے دیکھ رہی تھیں۔۔۔

''بھئی بھابی سا! آپ نے تو کمال کی بچی پیدا کی ہے''۔ کہتے کہتے انہوں نے بھتیجی کو گلے لگالیا۔ اُس کی پیشانی چُومی اور اپنے گلے سے سونے کی بھاری چین اُتار کر، بھتیجی کے گلے میں ڈال دی۔۔۔''یہ کیا بُوا۔ سونا ونا مجھے نہیں چاہئے۔۔۔ پارٹی لوں گی۔ پارٹی۔۔۔ آپ کے شہر کے میک ڈونل کا پزا اور کولڈ ڈرنک کی چُسکیں۔ واؤ''اُس نے چٹخارہ بھرا۔

''ضرور، ضرور۔ جو تم کہو گی وہی ہوگا۔ ہماری بٹو کے لئے خوب شاندار پارٹی کریں گے''۔ بھتیجی کو مطمئن کر وہ بڑے جوشیلے انداز میں بھاوج سے بولیں۔''بھابی سا۔۔ اسے چھٹیوں کے بعد اپنے ساتھ شہر لے جاؤں گی۔ ایسی ٹیلینٹڈ لڑکی کو تو کسی بھی من پسند کالج میں ایڈمیشن مل جائے گا''۔

''کسے دلوایا جارہا ہے، کالج میں ایڈمیشن؟''۔۔۔ بھاری بھرکم آواز سن کر نند بھاوج دونوں چونکی اور مُڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ کمرہ کے اندر داخل ہوتے ہوئے پنڈت رتن سنگھ پروہت کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے پلوؤں کو سنبھالا۔ قاعدے سے تعظیماً کھڑی ہوگئیں۔

''پدھارو۔ بھئی سا''! سفید کرتا، سفید کلف دار دھوتی، سنہری صافہ، پاؤں میں سنہری زری دار جُوتیاں اور گھنی مونچھوں کے ساتھ پیشانی پر لمبا تلک لگائے، لمبے چوڑے، اُجلے اُجلے، پنڈت رتن سنگھ، سیاہ رنگ کی پُرانی چیڑ کی نقشین آرام کُرسی میں سما گئے۔ نقش میں کئی جگہ گرد جمی تھی، جسے دیکھ کر

دل اور نظر دونوں کو ٹھیس پہنچتی تھی، رتن سنگھ کو بھی پہنچی، لیکن انہوں نے فوراً اُسے نظر انداز کرتے ہوئے کمرہ پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ دونوں نند بھاوج پھر سے اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔ روپ کنور نے اُسی اعتماد سے اپنی ٹرافی اٹھائی تو باپ نے کہا۔

''بھئی، ہمیں بھی تو دکھاؤ، یہ ٹرافی ۔۔۔ کون سے مقابلہ میں ملی''۔ باپ کی نظروں اور لہجہ میں پیار دیکھ کر، روپی کے چہرے پر پھر سے چمک آ گئی۔ بہت ہی نپے تلے قدموں سے، باپ کے نزدیک آ کر، اپنی ٹرافی اُن کی جانب بڑھاتے ہوئے کہنے لگی ۔۔۔ پتا جی، یہ ہمیں ''بیسٹ پرفارمینس'' کے لئے ملی ہے۔ باپ نے ٹرافی ہاتھوں میں تھامی، غور سے دیکھا، اور بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے آشیرواد دیا، اور کنکھیوں سے بیوی کی طرف متعارفانہ انداز سے دیکھا۔ راج کنور، بھائی بھاوج اور ان کے پیار کی نشانی کی کامیابی سے پیدا شدہ خوشگوار لمحات سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ انہوں نے موقع دیکھ کر بات چھیڑی۔ ''بھائی جی ۔۔۔ ہم روپ کنور کی ہی بات کر رہے تھے، بڑی ہوشیار بچی ہے۔ ہم تو کچھ بن نہیں پائے ۔۔۔ چاہتے ہیں کہ اسے قصبے سے نکال کر شہر لے جائیں۔ اونچی شِکشا دلوائیں، یہ ضرور ہمارے خاندان کا نام روشن کرے گی ۔۔۔ دراصل بھائی سا! روپی میں ہم اپنی پرچھائیں دیکھتے ہیں ۔۔۔ ہمیں خوشی ہوتی ہے کہ ہماری بھتیجی بالکل ہم پر گئی ہے۔'' انہوں نے پیار سے روپی کو دیکھا۔

بڑوں کو سنجیدہ گفتگو کی طرف مائل دیکھ کر، روپی ٹرافی لے کر اپنے کمرہ کی جانب بڑھ گئی، لیکن پھر کچھ سوچ کر، پلٹی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو، کان لگا کر اُن کی گفتگو سننے لگی۔ ۔۔ یہ باپ کی آواز تھی ۔۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے راج، تم جانتی ہو، ہم مجبور ہیں، بھلا اپنی برادری میں پہلے کبھی ایسا ۔۔'' بھئی سا! ۔۔۔ پھپھی نے بیچ میں ہی بات کاٹ دی۔ ''زمانے کی دھارا بہت تیز ہے، لڑکی کو پیروں ۔۔۔'' ابھی ان کا جملہ ادھورا ہی تھا کہ روپی کے کانوں میں کرسی کے ہتھے پر مکا مارنے کی ''دھم'' سے آواز آئی۔ اُس کے کانوں میں گرجدار آواز کے شول چبھنے لگے۔ ''بس ہم نے کہہ دیا ۔۔۔ دو مہینے بعد راج کنور کی شادی ہے۔ برابر کے پروہت ہیں۔ حویلی

خاندان، زمین، جائداد۔۔۔سب کچھ ہے"۔ روپی کا ذہن شائیں شائیں کرنے لگا، دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔"اتنا بڑا فیصلہ، وہ بھی اس طرح اچانک"۔ وہ اوٹ سے نکل کر، دروازے کے بیچ و بیچ آ گئی۔ اُس نے دیکھا، رتن سنگھ نے کُرسیوں کی دونوں ہتھیوں پر پورا زور دیتے ہوئے، کُرسی اس طرح چھوڑی کہ وہ تھرّا اُٹھی۔ پہلے، دوسرے پھر تیسرے قدم میں تو کمرہ سے باہر۔ اب بیٹی کے رُوبرو۔

"سُنیے تو، یوں جلدی میں کوئی فیصلہ"۔۔۔اور بیٹی سے آنکھیں ملیں تو ایسا لگا، جیسے بادل گرجے، بجلی کڑکی ہوا چلی اور بچہ سہما۔۔۔وہ گھبرا کر بیٹی سے نظریں چرانے لگے، اتنے میں پُشت سے راج کنور نے ہمّت کر کے، جاتے ہوئے بھائی کا ہاتھ تھام کر، اپنے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔۔وہ برابر آ چکی تھیں۔"راکھی کی لاج کا واسطہ دیتے ہوئے کہتی ہوں، بھئی سا، اس بچّی کو آپ مجھے دیدیں"۔ انہوں نے بھتیجی کو دیکھا، جو بے جان ہاتھوں میں ٹرائی لٹکائے، پکّے فرش کو، پاؤں کے انگوٹھے سے کُریدنے کی۔۔۔کوشش کر رہی تھی۔

"شادی تو ہونا ہی ہے، کر دیں گے، وہیں کریں گے، جہاں آپ چاہیں گے۔" بہن کے لَمس، التجا بھرے الفاظ اور ریشمی دھاگے کی مضبوط گرفت نے رتن سنگھ کے تناسب اعضاء کو مضمحل کر دیا۔ وہ لمحہ بھر رُکے، ٹھنڈی سانس بھری۔ بہن کی آنکھوں میں جھانکا، بیٹی کے انگوٹھے کی طرف دیکھا اور پھر نظریں بیچ کمرہ میں کھڑی، ڈھیروں سوالات کے جواب مانگتی ممتا پر پڑیں، کچھ سوچا۔ پیشانی کے بلوں میں کمی آئی۔ دھیرے دھیرے چہرہ کی سختی غائب ہوئی۔ اور سامنے رہ گیا۔۔۔خاندانی روایتوں اور وراثتوں کی گرفت میں، قید، مجبور باپ۔۔۔جس کی تھکی ہوئی آواز بہن، بیٹی اور بیوی کے کانوں میں پڑی۔

"راج، آخر تم سمجھتی کیوں نہیں۔ ہمیں یہ سب کرنا پڑے گا، ورنہ برادری سے باہر کر دیئے جائیں گے۔ ہمارے پیشہ پر آنچ آئے گی۔ ججمانوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اُس کی پڑھائی کو لے کر پہلے سے ہی، قصبہ کے لوگوں کا وِرودھ جھیل رہے ہیں۔ لوگ مذاق بنانے لگے ہیں کہ "اب اس حویلی

کی اُنگائیاں پنڈت بنیں گی'۔ اور تم آگے پڑھوانے کی بات کرتی ہو۔ تمہیں معلوم ہے، اس بات پر، پنچایت تک بیٹھ سکتی ہے۔ تم خود سوچو، تم تو بیاہ کر شہر چلی گئیں، جنوائی سا بزنس میں ہیں۔ کریا کرم، تنتر، منتر وِدھیا سے اُن کا اب کوئی لینا دینا نہیں رہا۔۔۔ لیکن ہم کہاں جائیں؟ دو بھائی اور ہیں۔ ان کے شادی بیاہ، بال بچے سبھی کچھ ہے۔ سب سے بڑا ہوں"۔ بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے۔ "آگا پیچھا تو مجھے ہی دیکھنا ہے نا۔ آخر ایک کے پیچھے اتنے ہیں۔۔۔ یہ کہتے کہتے، رتن سنگھ بھاری گلے، ڈھیلے کندھے اور بوجھل قدموں سے، اپنے کمرہ کی جانب بڑھ گئے۔

بہن کے کانوں نے سُنا، آنکھوں نے دیکھا، نہ معلوم کتنا اور کیا سمجھیں، بس کچھ کسمسائیں ضرور لیکن نہ کچھ کر سکیں نہ کہہ سکیں، بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہ گئیں۔ سب کچھ سُن، سمجھ کر، روپی، جیسے آسمان سے گری۔ ایک پھوپی کی طاقت تھی وہ بھی یوں پست ہوتی نظر آئی۔ جوان خون اور وہ بھی لڑکپن کا، بس اُبال آ گیا۔ سہما ہوا بچہ، اب غُرّا رہا تھا۔

"میں پوچھتی ہوں باپو، آخر کب تک ہم اِس سسٹم کی بھینٹ چڑھتی رہیں گی۔ یہ تو کمیونسٹوں سے بھی بدتر ہے، ذہن، منن، وژن۔ سب کا ناش کرنے والا"۔ اب وہ باپ کے رُوبرُو تھی۔ "جیو کی مرتیو تو یہیں ہو جاتی ہے باپو، ہاڑ مانس کے لوتھڑے کو مُنشئے نہیں کہتے۔ نہیں باپو۔۔۔ میں لوتھڑا نہیں بننا چاہتی۔ مجھے ادھیکار چاہئیں۔ آپ نے تو شاستر پڑھے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے۔۔۔ کیا سماج نہیں جانتا۔ خود شاستروں کی رَچنا استری نے کی ہے۔ پھر ہماری گرنی ماتا بھی تو استری ہی تھیں۔ باپو، میں استری کی اُسی کھوئی ہوئی اَسمتی کی تلاش میں ہوں"۔ روپی ایک سانس میں اتنا کچھ کہہ گئی، جتنا اپنی پوری عمر میں اُس نے اپنے باپ سے نہیں کہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اور کچھ کہتی۔ رتن سنگھ حیرت وانہماک کے ملے جلے انداز سے بیٹی کے ان تیوروں کو دیکھ، سُن رہے تھے، بے حد سنجیدگی سے بولے۔۔

"مجھے پرسنّتا ہے کہ تمہارے گیان میں وِردھی ہوئی ہے۔ لیکن بیٹی، جب اتنا کچھ جانتی ہو تو، یہ بھی معلوم ہوگا کہ سسٹم یوں اچانک نہیں بدلا کرتے۔ ہے کوئی لڑکی، جو اس قصبہ میں بارہ کلاسیں پڑھی

ہو۔ ہم روشنی کی طرف اکیلے نہیں بڑھ سکتے۔ سب کو ساتھ لے کر بڑھنا ہوگا۔ کچھ آ گئی ہے، لیکن بہت کچھ آنا باقی ہے۔ اس میں بہت سے لگے گا"۔ یہ کہہ کر رتن سنگھ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے، وہاں سے روانہ ہوئے تو بیٹی نے ٹرانی اس زور سے پھینکی کہ وہ تیز آواز کے ساتھ بجتی ہوئی، رتن سنگھ سے پہلے زینہ اُتر گئی۔ اس کے ساتھ روپ کنور کے الفاظ ان کی سماعت میں گرم سیسے کی طرح اُنڈلتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"تو مجھے بُوا کے ساتھ بھیج کیوں نہیں دیتے۔۔ کہہ دینا۔۔ اپنے سماج سے مر مرا گئی۔"

سبھدرارانی تو بیٹی کو یوں ٹر کی بٹر کی جواب دیتے دیکھ کر سن رہ گئیں تھیں۔ لیکن جب رتن سنگھ نے اُن سے غصہ میں کہا کہ "سنبھالو، اپنی پتری کو۔۔ زبان لڑانا سیکھ گئی ہے"۔ تو وہ چونکی اور بیٹی کو گھڑکی دی۔

"روپی، کیوں اول فول بکے جا رہی ہے۔ باپ سے زبان لڑانے میں تجھے لاج نہیں آتی"۔ انہوں نے غضبناک ہو کر اُسے گھورا۔

"ماں میں زبان نہیں لڑا رہی، بلکہ اپنے جنم داتا سے اپنا ادھیکار مانگ رہی ہوں"۔ سبھدرا نے ایک لمحے میں سوچ لیا کہ گرم خون سے ڈانٹ ڈپٹ ٹھیک نہیں۔ فوراً لہجہ بدل کر بولیں۔

"شانت ہو جا، بٹو، ٹھنڈے مَن سے وِچار کر۔۔۔ ہمارے وَش میں کچھ نہیں ہے۔ کہاں جائیں گے ہم، پُرکھوں کے دیئے اس آشرے کو چھوڑ کر۔ جات باہر کر دیں گے لوگ۔۔۔ حویلی کیطرف انگلیاں اٹھیں گی۔۔۔ جو نہیں ہوا وہ ہو۔۔۔۔"

"اُٹھانے دو ماں۔۔۔ انگلی زیادہ دیر سیدھی نہیں رہ سکتی۔ نیلی پڑ جاتی ہے۔ ہار کر اُسے نیچے کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ دونوں سمجھتے کیوں نہیں۔ کب تک ان جھوٹی مان مریاداؤں میں جکڑے رہیں گے۔ کب تک ماں، کب تک باپو۔ آج کی لڑکی تو آسمانوں میں بکھر کر اَمر ہو رہی ہے اور آپ ہو کہ۔۔۔" تڑاخ۔۔ تڑاخ۔۔ تڑاخ۔۔ سبھدرا نے اس جرأت پر بیٹی کے گال لال کر دیئے۔

شور سن کر منجھلی بہو نے رسوئی سے نکل کر اوپر جھانکا۔ آنکھیں چندھیا کر، کان لگا کر،

ماجرا کیا ہے والے انداز میں سننے سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ بات معلوم تو تھی ہی، ذرا سی دیر میں سمجھ میں آ گئی۔ اور کیوں نہ آتی۔ ایسے موقعوں پر عورت کی تیسری آنکھ، اور عقل کی کھڑکی کا دوسرا پَٹ پھٹا پھٹ کُھل جاتا ہے۔ دل مچلا کہ وہاں جا کر منظر کے مزے لیں، لیکن جیٹھ کی موجودگی نے بیڑیاں ڈال دیں۔ آخر دل کا غبار تو نکالنا ہی تھا۔ خود کلامی سے یوں نکالا۔

''جیٹھ جی بھی، اونہہ! دُنیا کو دَرس دیتے پھرتے ہیں اور آپ لڑکی کو پڑھوا کر دھرم بھرشت کرنے میں لگے ہیں۔ ہمارا پیر نہیں پڑتا بڑوں کے سامنے اور اُسے دیکھو، کیسی کتر کتر زبان چلا رہی ہے۔ کل کی چھوکری''۔ انھوں نے برا سا منھ بنایا اور اُلٹے قدموں سے واپس چولھے تک آئیں اور پتیلی میں پک رہی سبزی کا ڈھکّن کھول کر اُس میں زور زور سے چمچ چلانے لگیں۔۔۔ بھگوان جانے، اس کُل کی لاج بچے گی کہ نہیں، یہ ساسو ماں آج کہاں ہیں۔ شاید سو رہی ہیں، رات طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ورنہ دیکھتیں اپنی لاڈلی پوتی کی زبان درازی''۔ سبزی کی چھَن چھَن میں ان کی بڑبڑاہٹ گُھل گئی۔ لیکن باہر سے مسلسل احتجاجی آوازیں آ رہی تھیں۔ روپی کہہ رہی تھی۔

''مار لو ماں، جتنا چاہو مار لو، پر مجھے مُکتی دے دو۔ بُوا کے ساتھ بھیج دو''۔ یہ کہہ کر روپی اپنی ٹرافی لے کر، جھنجھلاتی، پیر پٹختی، اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

''دیکھ لیا شہ کا نتیجہ۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے''۔ رتن سنگھ بہن کی طرف عجیب تیوروں سے مخاطب ہوئے۔ اور دوسرے ہی پَل گہری سوچ میں مبتلا ہوتے تُلے قدموں سے سیڑھیاں اُترنے لگے۔ اور راج کنور کو تو اس وقت ایسا لگا جیسے انہوں نے ساکشات دیوی کے دَرشن کر لئے ہوں۔ آج انہیں اپنے قصبہ کی زمین، آسمانوں کی طرف ہمکتی نظر آئی۔ چند لمحوں میں جیسے ہزاروں صدیوں کا مجموعی غصہ، اندوہ، دبا ہوا غبار۔ آتش فشاں کے دہانے سے لاوا بَن کر پھوٹ پڑا ہو۔ بھتیجی کے اشتعال انگیز احتجاج کو دیکھ کر ان کی خوشی کا تو ٹھکانہ ہی نہیں رہا۔ یہی وجہ تھی کہ ان تینوں کے گرما گرم مباحثہ میں حصہ لینا انہوں نے ضروری نہیں سمجھا۔ اور بھائی کے تلخ لہجہ اور طنز کو بھی انہوں نے ملائم تبسم کے ساتھ قبول کر لیا۔

سبھدرا راآئی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔شوہر اور نند کو بے بس نظروں سے دیکھا۔سر پہ آنچل کو ٹھیک کیا۔کمر سے ٹُمے چابیوں کے گُچھے کو سنبھالا اور روپی کے تیوروں سے فکر مند، پژمردہ چہرہ لئے مڑیں اور اندر جا کر مسہری پر بچھی چادر کی سلوٹوں کو درست کرنے لگ گئیں۔ایک کونے سے چادر کو کھینچ کر دُرست کرتیں تو دوسری طرف شَل پڑ جاتے، وہ اُسی طرف جا، وہی عمل دہراتیں تو بیچ میں شَل آ جاتے۔آخر سلوٹیں بدستور رہیں تو انہوں نے جھنجھلا کر اُسے چھوڑ دیا۔۔۔شاید چادر سکڑ گئی۔۔۔پھر سر کھجانے لگیں آگے بڑھیں اور ناگہاں ٹیبل پر قرینے سے رکھے لیمپ اور گھڑی کو بے ترتیب کر دیا۔پھر شاید تھکان کا احساس ہوا یا کیا؟۔۔۔جسم کو مسہری کے حوالے اس طرح کیا جیسے وہ بے جان لوتھڑا ہو۔خالی آنکھوں سے چھت کو گھورنے لگیں۔۔۔پتہ نہیں وہاں کیا تلاش کر رہی تھیں۔۔۔!!

(باب۔۲)

راج کنور بھتیجی کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتی تھیں ،لیکن بھائی کی مجبوری اور خاندانی دباؤ کی وجہ سے وہ ایک بار پھر پست ہوگئی تھیں۔لیکن روپی کو لے کر، انہوں نے اب بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔وہ اُس کے پیچھے کے پیچھے آئیں۔سرہانے بیٹھ کر، بالوں میں انگلیاں ڈالتی ہوئی اپنے لمس سے اُسے تسلی دینے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔لمس کی تقویت سے روپی کا غبار جھر جھر کر بہنے لگا۔''بُوا، میں مندر جاؤں گی۔دیوی ماں سے پرارتھنا کروں گی، وہ کوئی نہ کوئی چمتکار اَوشے کریں گی''۔روپی کی سسکیاں بڑھتی ہی جارہی تھیں۔

''نہ بٹو، نہ۔۔۔یُوں ہمت نہیں ہارتے۔دیوی ماں کا آشیرواد تیرے ساتھ سدا رہے گا''۔راج نے اُسے سینے سے لگالیا۔روپی ایسے دَبک گئی، جیسے چوزا، مُرغی کے پروں میں سما جاتا ہے۔پھوپی کا آنچل بھیگنے لگا۔اتنے میں دروازہ پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔راج کنور نے دیکھا، بھابی سا، کھڑی ہیں۔انہوں نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر بھاوج کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔روپی کی ماں سبھدرا رانی نپے تلے قدموں سے آکر آہستہ سے پائینتی بیٹھ گئیں۔مایوسیوں کے سیلاب نے امیدوں کے گھنیرے سایوں کو نگلنا شروع کردیا۔سب خاموش تھے، مگر دیوار گھڑی کی ٹک ٹک ذہنوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

راجپوتانہ کی شان وشوکت تشکیلِ راجستھان میں ضم ہوگئی تھی۔لیکن یہ ضلع راٹھوڑ راجپوتوں کے راج پروہتوں کے خاندانوں سے آباد تھا۔بیکانیر سے کوئی پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ''دیش نوک'' قصبہ کو کون نہیں جانتا۔۔۔سب ہی تو جانتے ہیں۔کیوں نہیں جانیں گے بھلا۔۔۔یہاں چوہوں کا مندر جو ہے۔یہ چوہے، جنہیں ''کابا'' کہا جاتا ہے، دیوی کرنی ماتا کے خدمت گار

''بیٹھوؤں (مندر میں دیوی کے خدمت گار)'' کے مرنے پر چوہوں کے روپ میں جنم لے کر مندر کی رکھوالی کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بیسویں مہینے میں جب 'دیول بائی' کے بچہ پیدا نہ ہوا تو، ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک لڑکی ہاتھ میں ترشول لیے کھڑی ہے، اور کہتی ہے۔

''اے ماتا، میں تمہاری ہی کوکھ سے جنم لوں گی۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ میں اپنی مرضی سے باہر آؤں گی''۔ اس طرح جب اکسویں مہینے میں بچی پیدا ہوئی تو، لڑکے کی خواہش رکھنے والی، اُس کی پھوپی نے نوزائدہ بچی کے سَر پر دھیرے سے ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے، رُوکھے پن سے اتنا کہہ دیا۔۔ ''پھر پتھر ہی آپڑا''۔۔ یہ کہنا تھا کہ آن کی آن میں ان کی پانچوں انگلیاں آپس میں جُڑ گئیں۔ سب پریشان ہوئے۔ کئی جتن کیئے، مگر کوئی کارگر ثابت نہ ہوا۔ آخر پھوپی نے اپنے بھائی سے کہا کہ۔ ''یہ لڑکی سنسار میں کچھ کر دکھائے گی''۔ یہی ہوا۔ روز بروز اس کے چمتکار بڑھتے گئے اور وہ ماتا کرنّی کے نام سے مشہور ہوئی۔ کرنّی ماتا کا یہی مندر قصبہ کے باشندوں کی معاشی حالت کو سنبھالے ہوئے ہے۔ دور دور سے معتقد اس کے درشن کو آتے ہیں۔ "season" میں کچھ آمدنی ہو جاتی ہے، ورنہ ریگستانی علاقہ ہونے کے سبب، زرخیزی کیا ہوتی ہے، یہاں کے لوگ کم ہی جانتے ہیں۔ کیونکہ بارش بھی بھگوان بھروسے ہی ہے۔ شہر سے کوئی موٹر گاڑی بھی نہیں آتی۔ پکّی سڑک جو نہیں ہے۔ لوگ اونٹ گاڑیوں سے کام چلاتے ہیں۔ لے دے کے ایک تالاب ہے۔ بارش ہوتی ہے تو فوراً لبالب بھر جاتا ہے، ورنہ سالوں سال سوکھا پڑا رہتا ہے۔ اس سال بھی یہ بھر گیا تھا۔

ہوا یہ کہ، ایک دن نہ جانے کہاں سے امنڈ گھمنڈ کر کالی گھٹائیں آگئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اندھیارا چھا گیا۔ ہوا کے جھکڑوں کیساتھ ایسا مینہہ برسا کہ پیاسی دھرتی منگل منگل ہو اُٹھی۔ بزرگوں کو چہرے کِھل اُٹھے۔ پہلے ایسی بارش کب ہوئی تھی، وہ حساب لگانے لگے۔ ہر کوئی ہر کسی سے کہتے سُنا گیا کہ ''واہ کیا جھوم کے آئی اور کیسی ٹوٹ کے برسی۔ آنند آ گیا''۔۔۔ بچے گھروں سے باہر نکل آئے۔۔۔ کالے، گورے، ننگے، بوُچے۔۔۔ ایک ٹولی گلیوں میں چھبل

چھبل کا شور کرتی تو دوسری کاغذ کی ناؤ چلانے کی ہوڑ، تو کسی کو کیچڑ میں لوٹنے کا خمار، تو کسی کو خود بچ کر دوسروں کو بھگونے کی مستی۔۔۔ ماؤں نے فوراً مال پُوئے بنانا شروع کر دیئے۔۔۔ چھنَن۔۔چھنَن۔۔پوریاں تلی گئیں۔۔کچھ بچے اسکول گئے تو وہاں چھٹی ہوگئی، وہ اچھلتے کودتے، گھر آنے کہ بجائے سیدھے تالاب کی طرف چلے گئے۔اور بستہ ایک طرف رکھ، کپڑے اُتار، ننگ دھڑنگ، تالاب کے کنارے کھڑے بوڑھے برگد کی اُدھیڑ ڈالوں پر سے پانی میں چھلانگیں لگانے لگے۔بس جب کبھی ایسا موسم آتا، برگد کا پتہ پتہ جھوم اٹھتا۔بوڑھے برگد کو سہارا دیتی بدصورت مگر جوان کنبھ جڑیں بھی لہلہا اٹھتیں۔۔روپی بھی اُس دن ماں سے چپکے سے اجازت لے کر حویلی کے داہنی طرف، کچھ فاصلے پر، ایک جھونپڑے میں رہنے والی اس کی سہیلی رمیا کے ہاں چلی آئی تھی۔

''کھٹ، کھٹ، کھٹ۔۔۔ارے رمیا، اتنا اچھا موسم ہے اور تو اندر یہاں کیا کر رہی ہے''۔رمیا نے کواڑ کھولے تو روپی نے اُسے کچھ اُداس پایا۔

''براجو، روپ کنور جی''۔۔۔اُس نے کھاٹ کی طرف اشارہ کیا۔جس پر دُھلی دُھلائی گدڑی بچھی ہوئی تھی۔

''کیا یہ دن یہاں بیٹھنے کا ہے، ماں سے آگیا لے کر بڑی مشکل سے آئی ہوں۔معلوم تھا جی جا سا، شہر گئے ہوئے ہیں، چل برگد تک چلیں۔سُنا ہے وہاں جھولے پڑ گئے ہیں''۔روپی اپنی ہی دُھن میں مگن تھی، رمیا کی اُداسی دیکھنے کی فرصت کہاں تھی، اُسے۔۔۔پھر اُس کے پاس وقت بھی کم تھا، چپکے سے اجازت جو لی تھی، اور پھر سب کی آنکھ بچا کر بھی آئی تھی۔اس لئے اُس نے رمیا کا ہاتھ پکڑا اور تالاب چلنے کی ضد کرنے لگی۔۔۔رمیا اس کی بچپن کی سہیلی تھی، مگر شادی جلد ہونے سے وہ اپنا بچپن، لڑکپن سب میکے ہی چھوڑ آئی تھی اور پیا کے گھر آ کر بڑی ہوگئی تھی۔سنجیدہ بھی رہنے لگی تھی۔نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چہرے پر خوشی کے تاثرات لا کر، سہیلی کے ساتھ ہوگئی۔۔موسم واقعی

ا۔ صحرا کا خاص پیڑ

اُس دن بڑا ہی خوشگوار تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی۔۔۔دُھلے دُھلے، چھدرے چھدرے پیڑ۔۔ سر سبز و شاداب نظر آرہے تھے۔ ''ارے روپی، کیسے چلیں گے، راستہ تو بند ہے''۔ رمیا نے گلی میں ٹخنوں ٹخنوں بہتے پانی کو دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے گھاگرا پنڈلیوں تک اونچا اٹھاتے ہوئے کچھ پریشانی سے کہا۔

''ایسے''۔۔۔روپی نے اس پانی میں اُتر کر ایسا چھپاکا لگایا کہ پانی کے ڈھیروں چھینٹوں نے رمیا کو بھگو دیا۔۔ روپی کا یہ بچکانا روپ دیکھ کر، رمیا کا بچپنا بھی جاگ گیا اور دونوں پانی میں چھبل چھبل، پٹر پٹر کرتی، پانی کو چیرتی، اُچھالتی، کودتی، کدااتی تالاب کی طرف چل دیں۔۔۔ لیکن ایسی گلیوں سے جہاں آمد و رفت کم ہی ہوا کرتی تھی، تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ لیکن صاحب۔۔ اُس دن تو بچوں نے قصبہ میں اُدھم مچا رکھا تھا۔ ہر گلی، ہر جگہ ٹولے کے ٹولے۔۔ یہی نظارہ آسمان میں بھی دیکھنے کو مل رہا تھا۔ پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ ایک طرف سے دوسری طرف اُڑ رہے تھے، چہچہا رہے تھے۔۔۔ دُور کہیں اُس چھور پر دھنک اپنا جادو جگا رہی تھی۔ ریگستانی علاقہ اور یہ منظر۔۔ قدرت کبھی کبھی ایسے روپ یہاں بھی دکھایا کرتی تھی۔ اُس دن تو دیش نوک کی دھرتی واقعی میں اِترا رہی تھی۔ بچے، بوڑھے، جوان سبھی خوش تھے۔ اور موج منانے کے موڈ میں تھے۔۔ ایک موڑ پر جہاں چند دکانیں تھیں، روپ کنور اور رمیا وہاں سے جلدی جلدی قدم بڑھا رہی تھیں کہ، کسی نے پکارا۔

''بنو! اپڑیاں بھائی رے ساتھے کٹھے جاری ہے۔ اوُنی اوُنی جلیبیاں لیتی جا'' (بنو! اپنی سہیلی کے ساتھ کِدھر جا رہی ہو۔ گرم گرم جلیبیاں لیتی جاؤ)۔ سکھی رام نے اپنی دُکان پر بیٹھے بیٹھے منہ میں جلیبی کی خوشبو کی میٹھی لار بھر کر روپ کنور کو رس بھری آواز لگائی۔۔ یہ ان کا خاندانی حلوائی تھا۔ جس کے ہاتھ کی دیسی گھی کی جلیبیاں حویلی میں روز صبح کے ناشتے میں پروسی جاتی تھیں۔ روپی کے دادا کا ہم عمر تھا، جلیبیاں لاتا تو اکثر ان کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر گپ شپ کیا کرتا تھا۔ گھر کی زنانیوں سے بھی اُس کا کچھ خاص پردہ نہ تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا، جس نے شہر میں مٹھائی کی دُکان کھول لی تھی

اور وہیں بس گیا تھا۔

روپ کنور نے سکھی رام کو پرنام کیا۔۔ ''نمستے باسا'' ۔۔ ''جیتی رے بیٹا۔اوں دوڑوں سنبھالنے لے جا۔دیکھ پانڑی میں نی گر جاوے''۔ (جیتی رہو بیٹا۔لو یہ دونا۔ذرا سنبھال کے، پانی میں گر نہ جائے) سکھی رام سے بڑی احتیاط سے دونا لے کر روپی اور رمیا جلیبیاں کھاتی، بتیاتی چل دیں۔۔اپنی نرالی دنیا کی سیر کرنے۔قصبہ کی رونق بڑھتی جا رہی تھی۔صبح کی نرم شفاف دھوپ میں سہاگنوں کے لہریے اور موٹھڑے (ساون میں پہنی جانے والی ساڑی۔سیفون کی ہوتی ہے۔ہرا، نیلا اور انار دانا رنگوں میں ملتی ہے) اپنی الگ ہی چھٹا بکھیر رہے تھے۔ ہرے، سُرخ، پیلے، نیلے، گلابی گھاگروں، لوگڑوں اور ساڑیوں میں ملبوس خواتین ہاتھوں میں پکوانوں کی اُجلی، میلی پوٹلیاں لئے بچوں کے ساتھ تالاب کی طرف ہی جا رہی تھیں۔ گویا قصبہ میں میلا سا لگا ہوا تھا۔ تالاب کا کنارہ آ گیا۔رَمیا، روپی نے دیکھا۔۔۔برگد کی چھاؤں تلے تِل رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ جھولوں پر بچے اور خواتین باری باری سے جھوُل رہے ہیں۔گوریئیں مچکی بڑھا بڑھا کر لوک گیتوں کی پھُنوار کر رہی ہیں:

بنا رے، باگاں میں جھولا ڈالیا

مہارے ہوڑے سُوں کوئل بولے

مہارا کھیل بھنور سا۔۔۔

''اب میں''۔۔۔جھوُلا خالی ہوتے ہی روپی نے جلدی سے قبضہ کر لیا۔۔ دوسری لڑکیاں پیچھے ہٹ گئیں۔روپی اُچک کر جھولے پر چڑھی اور کھڑی ہوگئی۔رمیا نے اُسے زور سے جھونٹا دے کر چھوڑا اور خود بھی تیزی سے جھوُلے کی پٹی پر پاؤں جما کر رسّی پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔۔۔ دونوں سہیلیاں ایک دوسرے کے روُبرو۔۔اتنے قریب کہ سانسوں سے سانسیں ٹکرانے لگیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا مسکرائیں اور نہ جانے کیا ہوا کہ دونوں نے آپس میں ہونٹوں کو چوم لیا۔ پھر خود ہی شرما بھی گئیں۔۔۔اور اسی انبساط میں جو دونوں نے مچکی بڑھا کر جھوُلے کی رفتار تیز کی تو

مع جھولا، آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ رمیا کا گھاگرا اُڑنے لگا۔ کبھی گھٹنوں تک اُٹھ جاتا کبھی ذرا اور اوپر۔ لیکن وہ بے پرواہ، بے نیازانہ، مچکی بڑھانے میں لگی تھی۔ اتنے میں روپی نے مصرعہ چھیڑا۔

آئی برکھاری روُت، چالے سوُریو پوَن

تو رمیا نے تان چھیڑی۔۔۔

لائی سیانروں سندیشو گھر آوَنی بجن

دھیمے بالوہ نی بادیلا۔ ہولے ہالوہ نی بادیلا

اور پھر آخری مصرعہ کو دونوں نے ایک ساتھ گایا اور گاتی ہی چلی گئیں۔

جھالو سَیو نہیں جائے، جھالو سَیو نہیں جائے

ٹوٹے باجو، بندڑی لوم، لرُوا اُلجھی اُلجھی جائے

مہاراسترنگی لہریارَو، پلّو لہرائے۔۔۔دھیمے بالوہ نی۔۔۔

''اے بدّھو! یہاں خالی پانی میں کنکریاں مار رہا ہے، لہریں اُٹھانا ہی ہیں تو میرے ساتھ چل۔ اپنی روپی کو کنکریاں مارتا کہ اُس میں لہریں۔۔۔'' راجکمار نے بھیلو رانا کو سخت نظروں سے دیکھا تو اُسی کے لہجے میں کچھ شائستگی آئی۔۔۔''اپنی سہیلی رمیا کے ساتھ ہے، جھولا جھول رہی ہے۔ اکیلی آئی ہے۔ موقع موقع کیا کرتا ہے۔ لے بھاگ اور اِچھا پوری کر''۔ راجکمار خاموشی سے پال پر سے اٹھا اور بھیلو رانا کے ساتھ عجلت بھرے قدموں سے برگد کی طرف چل پڑا۔

''ہوُنہہ۔۔بھیلو نے لمبا ہُنکارا بھرا''۔''دل میں لڈّو پھوٹ رہے ہیں۔۔اور۔۔۔شرارت سے آنکھ ماری۔۔ راجکمار کو اُس کا اس طرح چھیڑنا اچھا لگا وہ زیرِلب مسکرا دیا۔ اور بڑے بڑے ڈگ بھرنے لگا۔ جلدی ہی وہ دونوں برگد تک پہنچ گئے۔۔اور۔۔روپی کو مچکی بڑھاتے ہوئے راجکمار نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

''کیا سوچ رہا ہے۔ بُلاؤں کسی بہانے سے''۔ بھیلو نے اُسے کندھے سے ٹلّا مارا۔''موقع

اچھا ہے''۔

راجکما نے روپی کو غور سے دیکھا۔ جھولے پر بھی نظر گئی۔ وہاں سے برگد کی شاخوں پر۔ اُسے وہ گھنی، ڈھلی ڈھلی، لمبی شاخیں اچھی لگیں۔ حیرت بھی ہوئی کہ یہ اتنی جلدی کیسے بڑھ گئیں۔ اُس نے روپ کنور پر سے نظریں جما کر جلدی سے، گھبراتے ہوئے ہٹالیں، جو اپنی دُھن میں نغمہ سرائی کئے جارہی تھی اور پینگی پر پینگی بڑھائے جارہی تھی۔

''کیا ہوا، آنکھیں نیچی کیوں کرلیں۔۔تُو بھی بَینڈا کا بَینڈا ہی رہا۔ بھابی کو جی بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا؟ پھر خود ہی بھیلو اپنی بات کا جواب دینے لگا۔۔''ہاں روپ ہی کچھ ایسا ہے''۔

''بکواس بند کر۔۔چل یہاں سے۔۔''بھیلو، راجکمار کے اس ردِ عمل پر حیران تھا۔ ڈانٹ کھا کر بھی اُس سے رہا نہیں گیا۔ بولا۔

''میں نے تو تجھے موقع۔۔۔''ابے سالے چُپ ہوتا ہے کہ دوُں جبڑے پہ۔۔۔ دانت باہر نکل آئیں گے۔۔۔تُو بھگانے کی بات کرتا ہے، میں تو اُسے چھو بھی نہیں سکتا۔ ہاتھ دیکھ ہیں میرے، کیسے ہتھوڑے جیسے سخت اور گھوڑے کے کھر جیسے کھر درے۔۔چھِل جائے گی وہ۔''راجکمار نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے مٹھی زور سے بھینچ کر بند کیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گاؤں کی جانب چل دیا۔ بھیلو کچھ سمجھا، کچھ نہیں۔ بَس سَر کھُجاتا وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

''آج تو آنند آگیا''۔۔جیسے ہی دونوں جھولے پر سے اُتریں دو ادھیڑ عورتوں نے آگے بڑھ کر رسّی تھام لی۔ اور رمیا، روپی کے کانوں میں ''ساونڑ'' کی آواز آنے لگی۔

سانوڑ آیو مہارا سو جتیا سردار بھنور جی، سانوڑ آیو ہو

اڈتو اندر دھڑ و نکے ہو، ہاں رے مہارے گھڑی نے گھڑی راو سرام

ڈھولا اِندر دھڑ و نکے او۔۔۔

مہاری سدا سُہاگن نار، ماتیرو آنڑوں تھانے آیو ہو۔

سانوڑ آیو۔۔۔

ا۔ ساون

''ہاں بہت آنند آیا''۔ روپ کنور نے رمیا کے گل بہیاں ڈالتے ہوئے قدم سے قدم ملائے اور جلدی گھر چلنے کا اصرار کرنے لگی۔ رمیا نے ہامی میں گردن ہلائی اور مسکراہٹ سے اُس کی بات کو اہمیت دیتے ہوئے چال کی رفتار بڑھادی۔ لیکن نہ جانے کیوں روپی کو اُس کی مسکراہٹ کچھ پھیکی سی لگی۔ بچپن کی سہیلی تھی، نفسیات سے واقف تھی اور موسم کے سرور کا اثر بھی کچھ کم ہوا تھا تو توجہ مبذول ہوئی۔ اُس نے رمیا سے سرگوشی والے انداز میں پوچھا۔

''کیا بات ہے، رمیا۔ تجھے میری سوگندھ، صاف صاف بتا۔ تو اُکھڑی اُکھڑی سی کیوں ہے''۔

''کچھ بھی تو نہیں۔ روُپ۔ ہاں آج آنند بہت آیا''۔

''دیکھ بات نہ بنا۔۔ سچ کہہ۔۔ مجھ سے کیا چھپانا۔۔۔ اپن تو پکّی سہیلیاں ہیں نا''۔ روپی نے رمیا کے گلے میں باہوں کی دبش دیتے ہوئے پیار سے پوچھا، تو رمیا کچھ کھلی۔

''وات آ ہے روپی کہ منّے راتوں سوُں مہارا سگلا پی اَری یار الوگاں ری اَولو آری ہے۔ تُو تو جانڑے، اَبے مہارو وُٹھے کوئی کونی''۔ (بات یہ ہے کہ مجھے رات سے میکے والے یاد آرہے ہیں۔ تجھے تو معلوم ہے، اب میرا وہاں کوئی نہیں'')

''ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے۔ پَرتو، دُکھی کیوں ہے۔ آنی جانی تو دنیا کی ریت ہے۔ سنسار ناشوان ہے، تیرے مَن میں کوئی اور بات ہو تو کہہ۔۔ رمیا تھوڑی جھجھکی، پھر اٹک اٹک کر کہنا شروع کیا۔

'' آپ تو جانڑوں ہی ہو، کنورسا، کی آ نپڑیں گاؤں میں کتنا سالوں بعد اِندر مہاراج ری کرپا ہوئی ہے۔ سو ساون را اِن مہینے، میں کالے، سینگ سُہاگڑیاں لہریا[1] پہن نے تالاب ری پوُجا کرنڑ واسطے جاوے لی۔ اور سینگ جنڑ یاں آپا نڑیں موٹیار ری لمبی عمر ری اِچھا کرے لا۔ بھگوان مہارے موٹیار نے بھی چوکھارا کھے''۔۔ یہ کہتے کہتے رمیا کی سسکی نکل گئی۔۔ اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر پھر کہا۔۔۔ ''پر نہ تو مہارے مائکے اور نہ مہارے سسرال میں کُئی کونی، جو مہانے لہریو

ا۔ دو شوخ رنگوں کی لہردار ساڑی۔ یہ سیفون یا جارجٹ کی ہوتی ہے۔ ساون میں پوجا کے وقت پہنی جاتی ہے۔ راجستھان کے مارواڑ، میواڑ خطہ میں اس کا رواج عام ہے۔ اور ضروری بھی۔

پہنادے۔ (آپ بھی جانتی ہو کنور جی، کہ اتنے ورشوں بعد اپنے گاؤں پر اندر دیو دیوتا کی کرپا ہوئی ہے۔ ساون کے اس مہینے میں کل سہاگنیں "لہریا" پہن کر تالاب کی پوجا کو جائیں گی۔ اپنے سہاگ کو ہرا بھرا رکھے منتیں مانگیں گی۔ لمبی عمر کی دعا کریں گی۔ بھگوان، میرے شوہر کو بھی خیریت سے رکھے۔ لیکن نہ تو میرے میکے میں اور نہ ہی سسرال میں کوئی ہے، جو مجھے لہریا خرید کر پہنادے)

"ہاں ہاں، وہ تو مجھے معلوم ہے۔ پر تو روتی کیوں ہے۔ بول میں کیا کرسکتی ہوں"۔

"مہارے گنو لہریو گونی۔ کالے کائیں پہنو؟ آئی بات ہوچ ہوچ نے مَن مُیں لاگ ری یَو ہے۔ (میرے پاس لہریا نہیں ہے۔ کل کیا پہنوں گی۔ یہی بات سوچ سوچ کر دل نہیں لگ رہا) رمیا نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"تو مَن میلا نہ کر۔۔۔ ماں سے مانگ کرلادوں گی۔۔۔ پہن لینا"۔ روپی نے اپنی جانب میں چٹکیوں میں مسئلہ حل کرتے ہوئے مسرت سے کہا۔

"نہیں کنور سا! پوجاماں مانگیو ڑ نہیں پَہنو"۔ (نہیں کنور سا! پوجا میں مانگے کا نہیں پہنتے)

"پھر۔۔۔؟ روپی، رمیا کے جواب کا انتظار بھی کرنے لگی، ساتھ ہی کچھ ترکیب بھی سوچنے لگی۔ لیکن رمیا نے تو کئی ترکیبیں پہلے سے نکال رکھی تھیں، بس انتظار تھا تو عملی جامے کا۔ وہ فوراً چہکی ایسے جیسے منہ میں شکر بھر دی ہو۔

"مہارے کنے ابار، سَونے اوپر پینتیس۔۔۔ (حساب لگاتے ہوئے سوچ کر) پانچ پینتیس رَوپیا ہے۔ تھے اِن روپیا رے مائینے اِتا روپیہ اور ملائی دو کی وہ دَدورام منے لہریو دَیئی دے"۔ (میرے پاس اس وقت ایک سوپینتیس روپے ہیں، آپ اس میں اِتنے اور ملادو کہ وہ ددّورام مجھے لہریا دے دے)۔

"ٹھیک ہے، رمیا۔ اتنے پیسے تو میرے گُلھڑ میں ہی نکل آئیں گے۔۔ کیا تو نے دام معلوم کئے تھے؟"۔

''ہاں دوسو روپیا مانگ رہو ہو۔'' رمیا کی آنکھوں میں جگنو چمک اُٹھے۔

''ٹھیک ہے، تو گھر چل میں ابھی آتی ہوں۔'' گھر آچکا تھا۔ چنانچہ روپ کنور حویلی کی طرف اور رمیا اپنی جھونپڑی کی جانب بڑھ گئی۔ روپی دبے پاؤں حویلی میں داخل ہوئی۔ لمبی چوڑی حویلی کی اتنی بھول بھلیّیں تھیں کہ اپنے آپ کو بآسانی چھپایا جاسکتا تھا چنانچہ روپی کو اپنے کمرہ تک جانے میں سہولت ہوگئی۔ جلدی جلدی الماری میں سے مٹی کا گُلھڑ نکالا، توڑا اور پیسے گِنے۔ جتنے چاہیے تھے، اُس سے زائد ہی نکلے۔ لیکن ریزگاری زیادہ تھی۔ ''کِس کِس سے ماری ہے''۔ وہ ہنسی بالکل شرارت والی، کُل کُل کرتی ہنسی۔ جتنے نوٹ تھے وہ لئے۔ بچی ریزگاری سیف میں رکھی اور رومال میں احتیاط سے باندھ کر، اُلٹے پاؤں روانہ ہوئی۔ باہر نکلنے کے لئے اُس نے پھر سے وہی لُکا چھپی والا عمل دہرایا کہ سہدرا رانی نے دیکھ لیا۔ وہ کسی کام سے اُس طرف آئیں تھیں۔ روپی کچھ گھبرائی۔ لیکن گھبراہٹ چھپاتے ہوئے بڑے ڈرامائی انداز میں ماں کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ پھر خود ہی بولی۔۔ ''ماں تالاب پر بہت مزہ آیا۔ رمیا کے ساتھ گئی تھی نا۔ لیکن ماں، اُس سے ایک ضروری بات کہنا تھی۔ وہ بھول گئی۔ بس یہ گئی، یہ آئی''۔ سہدرا دوبارہ جانے پر منع کرنے والی تھیں، لیکن بیٹی کو خوش دیکھا تو، ان کا دل باغ باغ ہوگیا۔ لیکن پھر بھی مصنوعی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے، انہوں نے کہا۔

''بٹو! جلدی آجانا۔ شام کو تالاب کنارے گوٹھ ہے۔ بس تھوڑی دیر میں گاڑی لگ جائے گی۔ برابر کی حویلیوں سے بھی سب آرہے ہیں۔ منّی چُنّی بھی آئیں گی۔'' اونہہ یہ منّی چنّی۔۔ مری مری سی۔ لُچو پُچو۔۔ بالکل بھی اچھی نہیں لگتیں'' وہ اندر ہی اندر چڑ گئی۔۔ لیکن پھر بھی گوٹھ کا سن کر اُسے خوشی ہوئی اور دل ہی دل میں دونوں خوشیوں کا موازنہ کر ڈالا۔ اُسے تو رمیا کا ساتھ ہی اچھا لگا۔۔ ''ماں پکے گا کیا؟ اُسے بھوک بھی لگنے لگی تھی، فوراً پوچھ بیٹھی۔

''دال باٹی، چُورما۔۔۔'' ماں نے انگلی پر کپڑے سُکھاتے ہوئے بتایا۔ آج رونی اکیلی تھی، دھوتی کی صبح سے ہی طبیعت خراب تھی، اس لئے دونوں دیورانی جٹھانی جلدی جلدی کام نبٹا رہی تھیں۔

''واہ ماں، منھ میں پانی آ گیا۔ کہتی ہوئی قلانچیں بھرتی، حویلی سے باہر نکل گئی۔ ماں مسکرانے لگی۔
رمیا یا اپنی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑی روپی کا انتظار کر رہی تھی۔ روپی نے بھی جلدی سے مع رومال پیسے تھمائے اور اُلٹے پاؤں یہ کہتے ہوئے روانہ ہونے لگی کہ ماں نے جلدی بلایا ہے۔۔
روپ کنور کی محبت اور خلوص کو دیکھ کر رمیا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اُس نے رومال کو ہاتھ میں لے کر نہارا اور بھرے گلے سے یہ کہتے ہوئے کہ'' آج مہانے پتو چلو ہو کہ مہارے مائیکا میں بھی کوئی ہے'' روپی کے گلے لگ گئی۔ روپی نے اُسے چپٹا لیا۔ پیٹھ تھپتھپائی اور یہ کہتے ہوئے الگ ہونے لگی کہ'' اب میں جاتی ہوں۔ شام کو حویلی والوں کی خاندانی گوٹھ ہے۔ ماں، راہ دیکھتی ہوں گی۔''
''بوری چھاچھ راکھی ہے۔ آپ پی کر جاؤ''۔۔''نہیں رمیا، پھر کبھی۔ تُو جا، دُکان سے لہریا خرید لا۔ کل جو پہننا ہے۔''
''آپ کے لارے ہی چلتی ہوں۔ دُکان اُدھر ہی تو ہے۔ اُس نے حویلی جانے والے راستے کی طرف اشارہ کیا۔ اور چولی میں پوٹلی ٹھونسی، خود کی جمع کی ہوئی رقم ہاتھ میں لے کر اُسے بھی وہیں گھسا دیا۔ کمزور کواڑوں کو بند کر کے تالا لگایا، لیکن اب بھی اُن میں اتنی چھیٹی تھی کہ دو تین چوہے اندر باہر آرام سے آ جا سکتے تھے۔ یا چور اچکّے ایک لات مارتے تو مع چوکھٹ دروازہ آن پڑتا۔ لیکن چوری چکاری یہاں نہیں ہوتی تھی۔ ایک تو پنڈت پروہتوں کا ڈر، دوسرے پنچایت کے سخت اصول اور فیصلے۔

نندو رام نے ڈھول پیٹ پیٹ کر قصبہ میں یہ اعلان کر دیا کہ تین بجے بعد تالاب کی طرف کوئی نہ جائے۔ پروہتوں کی گوٹھ ہو رہی ہے۔ چنانچہ دو بجتے بجتے تالاب کی طرف سے سب سمٹ آئے۔ کسی کی مجال نہ تھی، جو اس فرمان کی نافرمانی کرتا۔ برسوں سے چلا آ رہا رواج جو تھا کہ جس دن پروہتوں کی زنانیاں تالاب گھومنے جائیں اُس دن اُدھر کوئی نہ جائے۔ بے پردگی ہوگی۔ برسہا برس سے لوگ بے چوں، چرا اس پر عمل کرتے آ رہے تھے۔ لیکن کچھ لڑکے بالے تھے، جنہیں یہ رواج ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ راجکمار، بھیلو رانا۔ راما اور ہنسا۔ چوکڑی تھی چاروں پکّے دوستوں

کی۔ آٹھ دس کلاسیں لکھ پڑھ گئے تھے۔ مندر کے احاطے کے باہر دیوی کے چڑھنے والے تبرّک کی چھوٹی چھوٹی دُکانیں لگاتے تھے۔ گورنمنٹ کی طرف سے الاٹ ان کیبنوں کو انہوں نے پاس پاس ہی لیا تھا۔ البتہ بھیلو رانا نے آج کل اپنی دُکان کرائے پر دے رکھی تھی۔۔ سیاحوں کے ساتھ رہ رہ کر تھوڑی بہت انگریزی کی ٹِگر پٹر سیکھ گیا تھا۔ بس بن گیا گائڈ۔ باتیں تو لچھے دار کرتا ہی تھا۔ خوب چٹخارے گھول گھول کر کرتی ماتا کے چمتکاروں کی داستان بیان کرتا کہ سننے والے کو کھٹا میٹھا مزہ آتا۔۔ لوگ ان لچھوں سے واقف تھے، پھر بھی مزے لے لے کر، مسکرا مسکرا کر سنتے۔ محظوظ ہوتے۔ اچھی بخشش دیتے۔ پھر نئے نئے لوگوں اور خاص طور سے گوری میموں کی قربت کا شوقین بھیلو اپنے کام سے خوب مطمئن تھا۔

لیکن راجکمار جسے یہ راجُو کہتے تھے، رامؔا، اور ہنسؔا۔ یہ تو ناریل، کلاوا، پھُول، بتی اور چنے مونگ پھلی۔ میں ہی خوش تھے۔ گزر بسر ہو جایا کرتی تھی۔ سب کے کچے پکّے گھر تھے۔ البتہ راجو کا دو منزلہ مکان تھا، جو اس کے باپ نے پوری تیس بیگھ زمین فروخت کر کے تعمیر کروایا تھا۔ مگر راجو تو راجکمار تھا۔ مطمئن کیسے ہوتا۔۔ اُسے تو پروہتوں کی حویلیوں کی بلندیوں سے حسد ہوتی تھی۔ جب بھی اُدھر سے گزرتا۔۔ اونچائیوں کو دیکھ کر نفرت سے بھر جاتا۔ اُس طرف کا جتنا راستہ طے کرتا، ذہن میں بہت کچھ گڈمڈ ہوتا رہتا۔۔۔ غریبی۔۔۔ نیچی ذات۔۔۔ پھر چولی۔ پھر دامن۔۔۔ اور پھر۔۔۔ روپ کنور۔۔۔؟ پھر اُس کی آنکھیں لال ہو جاتی، مٹھیاں بھنچ جاتیں، نسیں تن جاتیں، قدموں اور سانسوں کا توازن بگڑ جاتا۔ ۔۔ لیکن پھر اُس کے بعد کچھ نہیں۔۔ سوائے مجبوری و بے بسی کے۔۔۔ اور مجبوریاں بغاوت نہیں کیا کرتیں۔۔۔ تینوں دوست اُسے سنبھالتے۔۔۔''

''چھوڑ یار، یہ باتیں اپن کے سوچنے کی نہیں۔ کیوں جان جلاتا رہتا ہے کوئلے کی مافق۔ بھیلو، اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گلے میں ڈال لیتا اور خود بھی کڑواہٹ سے جب اُدھر دیکھتا تو حویلی کی اونچائیوں کو چھوتے چھوتے گردن پیچھے کی طرف لُڑھک جاتی۔ تب کہیں پھنگی نظر آتی۔۔۔ وہ بھی

سوچتا۔۔۔" بات تو راجو پتے کی کہتا ہے۔۔ پر فضول کہتا ہے۔۔ کچھ ہونا جانا نہیں۔۔۔ کاہے کو کُڑھیں"۔

دوپہر میں گراہکی نہ کے برابر ہو جاتی تھی۔ پھر آرتی کے وقت ہی بھیڑ جُٹتی تھی۔ چنانچہ اس درمیان دھندا مندہ رہتا تھا۔ تینوں دوست دُکانیں بند کر، آپس میں باتیں کرتے ہوئے گھر کی طرف چل دیئے۔ راستے میں بھیکو بھی مل گیا۔ حویلی کی طرف سے پھر گزر ہوا۔ اور راجو کے تصور میں روپ کنور کا سراپا گھوم گیا۔۔ وہ جھولا، وہ پچکی۔ اُس نے بڑے رومانی انداز میں بھیکو کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"سُن بھیکو! آج شام پروہتوں کی گوٹھ ہے۔ روپ بھی آئے گی۔ صبح تو میں نے آنکھیں نہیں ملائیں۔ پر اب شام کو چلیں دیکھنے۔۔۔!

"انگور کھٹے ہیں، بچو! بھول گیا، پچھلی بار کی ٹھکائی۔ چوری چھپے ان زنانیوں کی گوٹھ دیکھنے کا کیا دنڈ بھوگا تھا"۔ یہ کہہ تینوں دوست ہاتھ پر ہاتھ مار کر، تالی دے، ٹھہاکے لگانے لگے۔

راجو کے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی، چُبھی اور اُسے بہت کچھ یاد آتا چلا گیا۔ وہ تالاب کا لبالب چھلچھلاتا پانی، وہ پُروائی ہوا، وہ ٹنوریاں، وہ جھومتا برگد، وہ لچکا کھاتی اُس کی ڈالیاں، وہ کھبجڑیوں کا اپنی چھدری چھدری چھانوں پر جھوم جھوم کر ناز کرنا۔ وہ جھولے، وہ جھولنا، وہ زنانیوں کا سِنگار، اِک خاص ادا سے اُٹھنا، بیٹھنا، ٹھہرے اور سنجیدہ انداز سے گفتگو کرنا۔۔" ہماری جنانیں۔۔ کیسے چپڑ چپڑ باتیں کرتی ہیں، کیسے ہی ہی ہی ہنستی ہیں۔۔۔ بے لگام سی ہنسی۔۔۔ ہونہہ"۔ لیکن وہ پھر سوچتا۔۔" اس ہنسی میں کوئی بناوٹ بھی تو نہیں ہوتی۔ دیکھو ان جنانیوں کو کیسی ڈھلی ڈھلائی لگتی ہیں جیسے چندو لوہار اپنے لوہے کو ٹھوک پیٹ کر جیسا چاہتا ہے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔۔ یہ پنڈت۔۔ اُف ان کی جنانیں۔۔ باہر کی دنیا سے کٹی کٹی۔۔۔!

"سُٹا مارتے ہیں یار، بیڑی وبڑی نکال۔۔ یہیں کہیں بیٹھ کر تنک وِشرام کریں"۔ چلتے چلتے ہنسا نے راجو کے شانے پر اپنا ڈھیلا سا ہاتھ مارا تو وہ خیالوں سے باہر آیا۔ گلی کے آخری چھور پر نیم کے

پیڑ کے تنے کے اِرد گرد بنی گول چبوترے پر چاروں بیٹھ گئے۔ اور اکلوتی بچی بیڑی کو سُلگا کر دُھنویں میں اُڑانے لگے۔ دو دو کش لئے ہوں گے کہ بیڑی ٹھونٹھ ہو گئی۔ اس درمیان راجو مسلسل حویلی کو تا کتا رہا۔ "پنڈتوں کے لٹھیت، پنچایت میں بے عزتی"۔ اُس نے ٹھونٹھ کو زمین پر پھینک پاؤں سے ایسے مَسلا کہ وہ پلک جھپکتے ہی گیلی ریت میں دفن ہو گئی۔

"کیا سوچ رہا ہے، پچھلی مار، کہ دال باٹی کی کھسیوٗ کا سُواد"۔ راما جو خاموشی سے راجو کے تصادم کا اندازہ لگا رہا تھا، چُہل کرتے ہوئے اس لئے چھیڑنے لگا، تا کہ اُس کا یار ذہنی کرب سے باہر آجائے۔ "کیا سوندھی سوندھی اسپیسل کھسیوٗ تھی۔ آج تک یاد ہے۔۔ وہ پکوان بنانے والا رسوئیا، وہ حلوائی سکھی رام۔۔ کتنا بڑا "کرا"[1] لگایا تھا اُس نے۔ بالکل اپنے گھر کے چوک جتنا لمبا چوڑا۔۔ اور وہ رامڑی بائی۔۔ اِس دن کے لئے کب سے گوبرا کٹھا کرتی ہے۔ دَس رُوپیا پا کر وہ اُس دن کتنی کھُس تھی"۔

"کیا تو، ہر بات ری کھبر رکھے ہوئے تھا"۔ راما نے بھیلو کو آنکھ مارتے ہوئے شرارت سے دیکھا۔ "نہیں۔ وہ اپنی مُنّی چار آنے کے کنڈے لینے گئی تھی، تو بُڑھیا نے بتایا۔ وہ کھُسی کھُسی دس کا نوٹ اپنی پچکی چولی میں رکھ رہی تھی۔

"ایسے"۔۔۔ راما نے ننھی کنکری اٹھا، پاس سے گزرتی ہوئی چھمیا مالن کے گھیر دار رنگیلے گھاگرے پر ماری، جو بڑے اطمینان سے، اُن چاروں کی نظروں سے بے پرواہ فروخت ہوئی سبزی کی ریز گاری کو میلے کچیلے کپڑے میں باندھ کر، اپنی گاڑھی نیلی چولی میں ٹھونس رہی تھی۔ اُسے پتہ بھی نہ چل سکا کہ کسی کی کنکری اُس کے گھیر دار ست رنگی گھاگرے میں اُلجھ کر، کب اِدھر اُدھر ہو گئی۔

"نہیں یار۔۔ تو بھی، ایک بُڑھیا اور ایک پٹھی کی چولی میں بھید ہی نہیں کر سکتا کیا؟ سُن! میرے واکیہ پر کان دَھر۔۔ "بُڑھیا رکھ رہی تھی، یہ ٹھونس رہی ہے"۔ ہی ہی ہی ہی۔۔۔ تینوں دوستوں

---

[1] ا۔ گوبر کے چھینوں کا گول بڑا گھیرا بنا کر اُسے جلا دیا جاتا ہے۔ پھر دہکتی راکھ میں باٹیوں کو دبا دیا جاتا ہے۔ ڈھیرے ڈھیرے بھوبل میں سکتی ہیں۔ اسے "جگرا" بھی کہتے ہیں

نے اپنے اُجلے، پیلے دانت دِکھائے تو چھمیا کا دھیان اُن پر گیا۔ اُس نے ایک تیکھی زہریلی نظر اُن پر ڈالی، تو راجو بھی مسکرا اُٹھا۔

''روپ کنور تو کبھی کوئی نظر ڈالتی ہی نہیں''۔۔ اُس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔''پر اُس معصوم کو کیا پتہ۔ کبھی ہماری آنکھیں چار ہوئی ہوتیں، کبھی ملی ہوتیں تو۔۔۔! سوچتے ہوئے راجو نے ایک تنکے سے زمین کُریدنا شروع کر دی۔ تینوں دوست ابھی تک دال باٹی کے چکر میں تھے۔

''بڑے سے کڑھاؤ میں آٹھ دَس سیر گھی تو ہوگا۔ کیسی باٹیں تیر رہی تھیں۔۔ کتنا روغن ملایا تھا آٹے میں سکھی رام نے۔۔ اور وہی بھی کوئی تین چار کلو تو ہوگا ہی، بڑے پتیلے میں تھا۔۔ یار، وہی ملانے سے تو خستہ پن اور آ جاتا ہے۔۔ واہ! ہنسا نے زبان ہونٹوں پر پھیری۔''اور کالی دال میں ہینگ کا چھونک۔۔۔ واہ کیا سُواد رہا ہوگا''۔ ''یار اپن بھی گوٹھ کریں۔ ایسے ہی پکوان بنوائیں۔۔۔ اُس سکھی رام سے۔۔۔!

''ہونہہ! بلن رے کھواب میں چھیچھڑے ہی چھیچھڑے۔۔ یو اتو سَرل کونی بھایا، دیسی گھی گھڑوں موُنگو۔ ہے''۔ بھیلو نے مارواڑی میں جملہ پھینکا۔

(ہونہہ۔۔۔۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے، بھیّا، دیسی گھی بہت مہنگا ہے)

''کچھ پیسے بچاتے ہیں، بیڑی دارُو کم کر دیں گے''۔ ہنسا چہکا۔

''چوُرما بھی بنے تو بات ہے، کالی دال میں چوُرما ملا کر کھانے کا آنند بھی کچھ اور ہوگا''۔

''ہاں ہاں۔ اب کے مہینے گوٹھ کریں گے۔ پر تالاب پر نہیں، کہیں بستی سے دور۔۔ بہت دُور۔۔ ورنہ گھر والوں کو پتہ چل جائے گا تو۔۔۔!

''چل جائے تو چل جائے''۔ راجو پلاننگ میں شریک ہوتے ہوئے بولا۔

''ہم تینوں کے تو لُگائیاں ہیں۔ ٹابر ٹابری ہیں (ٹابر ٹابری: بیٹے بیٹیاں) جوُروہا کا کرے گی۔۔ تُو تو لنڈورا ہے''۔ تقریباً تینوں ایک ساتھ بولے۔ راجو نے ان کی بات غور سے سُنی اور ہامی بھرتے ہوئے کہا۔۔''ہاں یہ بات تو ہے''۔ اور مسکرا دیا۔ اب چاروں وہاں سے منصوبے بنا کر ایک ساتھ

اٹھے، جیسے وہ سچ مچ بچت کر ہی لیں گے۔ کیونکہ ایسی منصوبہ بندی کئی مرتبہ ہو چکی تھی۔ لیکن شام ہوتے ہی دیسی ٹھرّا انہیں کہیں کا نہ چھوڑتا۔

(باب۔۳)

تاحدِ نظر ریت ہی ریت اور ریت کے اس سمندر میں بسا ایک چھوٹا سا قصبہ۔ دلیش نوک کہ جسے گورنمنٹ کے ریکارڈ میں خوشحال قصبہ دکھایا گیا تھا، لیکن یہاں خوشحالی کو چھوڑ کر سب کچھ تھا۔ جہالت ایسی کہ میٹرک پاس ملنا محال تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم کا رواج تو بالکل نہیں تھا۔ ہاں پروہتوں نے اپنے وراثتی علم یعنی تنز منتر، کریا کرم کانڈ کو فروغ دے رکھا تھا۔ جو نسل در نسل چلا آ رہا تھا۔ گھرانے کے مرد جہاں سنسکرت، وید پُران کے پنڈت تھے وہیں عورتیں اَن پڑھ تھیں۔ حویلی کی اونچی دیواروں میں قید، جہالت کی لعنت سے لپٹی ہوئی نسائیت کے پاس، مرد کی چادر بننے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ تھا۔ نچلہ طبقہ محنت مزدوری کیا کرتا تھا، مندر آنے جانے والے سیاحوں کی تعلیم اور طرزِ زندگی سے یہ لوگ ضرور متاثر ہوتے تھے، لیکن ''موکش کی راہ اتنی آسان نہیں ہوا کرتی''۔

کہنے کو کچھ لڑکے بالے پرائمری اسکول میں پڑھنے جاتے تھے، جس میں ایک ماسٹر صاحب تھے، یہ جگت ''ماٹ صاب'' بڑی مشکل سے کان پر ہاتھ رکھ کر، ٹیڑھا منھ کر کے سننے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ آنگن باڑی تو ایسی تھی کہ اُس کی استانی کو خود ٹریننگ کی ضرورت تھی۔ پھر وہ ٹکتی بھی کہاں تھی بچوں کی رونق کے بجائے وہاں کوّے کاؤں کاؤں کیا کرتے تھے۔ ایک کوٹھری کی ڈسپینسری بھی تھی۔ جس کے نام کا بورڈ گھس گیا تھا اور لنگڑی ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کا دل نہیں لگتا تھا۔ جلدی جلدی میں جیسے تیسے الٹی سیدھی دوائیں لکھ دیا کرتے، گُہار کرنے پر سرکاری خزانے کی بچی کچھی دوائیں دے دیا کرتے پھر کئی کئی دن ندارد۔۔۔ آدھی دوا، آدھا علاج۔۔ لوگ جادو ٹونہ، جھاڑ پھونک میں نہ پڑتے، تو کیا کرتے۔ بچ جاتے تو ''دیوی کی کرپا'' مر جاتے تو ''بھاگیہ کا لکھا''۔ گزشتہ ہفتہ بھیرو کی بیوی کے ساتھ یہی ہوا۔ دو دن تک بے چاری درد

زہ میں تڑپتی رہی۔ تب جا کر ڈاکٹر کی صلاح میسر ہوئی۔ تقدیر کا لکھا۔ اُس نے شہر جانے کو کہہ دیا۔ اب بھیرو غریب کے پاس اتنے پیسے کہاں تھے۔۔ مسئلہ لے کر باپ بیٹے، پروہت جی کے پاس پہنچے۔ پنڈت بشن سنگھ خود تو بوڑھے ہو گئے تھے اور اپنے آپ کو حویلی تک محدود کر کے بیٹھ گئے تھے لیکن اپنے پُرانے نوکر بھیرو کے باپ کی، فریاد سُن کر، بیٹے رتن سنگھ سے سفارش کر دی۔ پنڈت رتن سنگھ نے باپ کی گدی سنبھال رکھی تھی۔ قصبہ بھر کا اچھا بُرا دیکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دونوں کو سرکاری اسکیم سمجھائی، پکا کاغذ لکھ کر دیا اور سرپنچ دامودر سہائے کے پاس لے جا کر دینے کو کہا۔ دونوں دامودر کے پاس دوڑے۔ ضلع پریشد کی طرف سے پھٹکار کھائے سرپنچ نے بغیر آنا کانی کئے پانچ سو روپے، پوری لکھا پڑھی کر کے تھما دیئے۔ یہ لئے لئے دوبارہ حویلی پہنچے۔ رتن سنگھ رسوخ والے آدمی تھے، فوراً اپنی جیپ دے دی، ڈرائیور کو سمجھا دیا۔

تقریباً دس میٹر کا گوبر سے لپا پُتا احاطہ، اور اس میں بنی چھوٹی سی جھونپڑی کے سامنے جا کر جیپ رُکی۔ ڈالی کو چار پانچ خواتین اور گومتی دائی نے پکڑ کر تین فٹ اونچے اور تقریباً دو فٹ چوڑے دروازے سے باہر نکال جیسے تیسے جیپ میں ڈالا۔ وہ سوکھی ڈالی کی طرح بے جان تھی۔ ایک گٹھری اور ایک پرانے میلے کچیلے تھیلے میں الٹے سیدھی، گری مڑی ہوئے چند پھٹے پرانے کپڑے، تھوڑا بہت بچے کا سامان، بڑھیا نے جلدی جلدی بھرا، اور بغل میں دبا، تھیلا ہاتھ میں لے، جھکی جھکی کایا لئے وہ جیپ تک پہنچی تو، بھیرو نے سہارا دے کر چڑھایا۔ پیچھے کا دروازہ بند کیا اور آگے ڈرائیور کے پاس بیٹھے بوڑھے باپ کو ہاتھ پکڑ کر نیچے اُتارا۔ پھر دل ہی دل میں نہ جانے کون سے بھگوان کو یاد کیا، دونوں ہاتھ جوڑ، پیشانی تک پہنچا، نمن کیا اور نہ جانے کیا بڑبڑاتے ہوئے ایک جھٹکے کے ساتھ جیپ میں گھس گیا۔ بیٹھ کر جیب میں پیسے ٹٹولے، اور مطمئن ہو گیا۔ بیوی پر پیچھے مڑ کر نظر ڈالی اور ڈرائیور کی طرف کچھ اس طرح دیکھا کہ ڈرائیور نے کہا۔۔ "من میلا نہ کر، ابھی پہنچا دوں گا"۔۔ اور کشن نے جیپ اسٹارٹ کر کچی سڑک پر ڈال دی۔ گلیر بچے شور مچاتے پیچھے دوڑے، جیپ کی رفتار تیز ہوتے ہی ادھر اُدھر غائب بھی ہو گئے۔ پشت سے

کراہنے کی مسلسل آوازیں آرہی تھیں۔تھوڑی دیر بعد جب بھیرو سے رہا نہیں گیا، تو پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ڈالی کے پیلے ہوتے چہرے پر اُس کی نظریں مرکوز ہو گئیں۔

''اے مہاری چوکھی چوکھی ڈالی، تھنے یہ کائیں ہوگیو'' (میرے پیاری پیاری ڈالی، تجھے یہ کیا ہوگیا)۔اُس نے دل ہی دل میں سوچا اور اُسی کیفیت میں کشن سے پوچھ بیٹھا۔

''مَنے تو ٹھا نئی اے۔کسی گاڑی کد آئی۔ تھنے ٹھا ہے کنیں؟ (مجھے تو معلوم نہیں، کون سی گاڑی کب آئے گی، آپ کو معلوم ہے کیا)'' کشن کے ہاتھ اسٹیرنگ پر جمے ہوئے تھے۔سوئی ساٹھ پر تھی اور نظر ٹیڑھے میڑھے راستوں کی پگڈنڈی پر۔کہ جہاں بالو ریت کے ٹیلے، جگہ جگہ اُبھرے ہوئے تھے۔اچانک ببول کی ڈالی کھڑکی سے ٹکرائی تو کشن نے اُسے سے بچاتے ہوئے جواب دیا۔

''بیس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔بس پورے دو گھنٹے بعد ملے گی''۔

یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک چیخ ایسی اُبھری کہ آس پاس کے درختوں پر بیٹھی چڑیئیں اور فاختائیں پھُر سے اُڑ گئیں۔کشن کا توازن بگڑا اور بھیرو نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ڈالی کا سَر، ماں کی گود میں تھا۔۔اور ماں۔۔جھنجوڑ جھنجوڑ کر، بہو سے کہہ رہی تھی۔''لاڈی۔۔او لاڈی۔۔تھنے کائیں ہوگیو۔۔کائیں ہوگیو۔۔باپ ڑی۔۔۔کچھ بولے کیوں نی؟۔۔۔اے مہاری لاڈی۔۔ آنکھیاں تو کھول۔۔۔!!

ڈالی بیس منٹ کے مختصر سے سفر کو چھوڑ کر لمبی مسافت پر نکل چکی تھی۔یہی حال دوسری وباؤں کا بھی تھا۔موتیابند کے مریضوں کا تو کہنا ہی نہیں پورا محلہ آباد ہو گیا تھا۔رتن سنگھ نے بہن راج کنور سے کہہ کر شہر کے لائنس کلب تک اپنی عرضی بھیج رکھی تھی کہ کبھی یہاں کیمپ لگائیں تو دو ڈھائی سو آپریشن کا کوٹا ہے۔اس کیمپ کی راہ تکتے تکتے لوگوں کی بچی کچی روشنی بھی ماند پڑنے لگی تھی۔

بجلی پانی کا بھی یہی حال تھا۔بجلی چند گھنٹوں کے لئے آتی تھی۔نل تو تھے لیکن ہوا کے

ساتھ کبھی کبھار پانی نکل آتا تھا۔لوگ کنوؤں اور باوڑھیوں سے کام چلاتے تھے۔قصبہ کے بیچ و بیچ ایک پرانی تاریخی باوڑی تھی۔جس میں سبھی کو پانی بھرنے کی اجازت تھی۔ چوکور سنہری پتھروں سے بنی اس باوڑی کے دونوں طرف بنی سیڑھیاں، مارواڑ کے عمارتی فن کا بیش قیمتی نمونہ تھیں۔ جن کے دونوں طرف بھگوان گنیش کی خوبصورت مورتیاں تراشی گئی تھیں۔جس چوکی پر اُن کے پاؤں رکھے گئے تھے اُس پر سنسکرت زبان میں اُس باوڑی کے تعمیر ہونے کی تاریخ، سموت اور راجا کا نام نقش تھا۔سامنے بائیں جانب نقشین پتھروں اور کھمبوں سے بنی چھتری پر بھگوان شِو تانڈو نرتیے کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے،اس کا کچھ حصّہ زائع ہو چکا تھا۔۳۱۵ رسال قبل تعمیر کی گئی اس تاریخی باوڑی کے اندر کی دیواروں پر کئی دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں، صفائی اور دیکھ ریکھ نہ ہونے کی وجہ سے مٹی کی گہری تہوں اور کائی کی پرتوں کے نیچے دب گئی تھیں۔مارواڑ کے راجہ راج سنگھ کے عہد میں وِکرم سموت ۱۶۹۰ میں تعمیر اس باوڑی کے فرش، دَر اور چھجوں پر پتّھر کی تراش خراش کا کام دیکھنے لائق تھا۔باوڑی کے لمبے چوڑے پرکوٹے کی اپنی اہمیت تھی۔موسم گرماں میں قصبہ کے لوگوں کا اکثر یہیں ڈیرہ رہتا۔خاص کر بزرگوں کا۔ایسی سوندھی اور ٹھنڈی بَیار بہتی کہ کُولر پنکھوں کا تصور بھی ان کے ذہنوں میں نہیں آتا۔

گزشتہ برس بجلی گرنے سے،اس باوڑی کا زیادہ تر حصّہ گر گیا تھا، جسے قصبے کے معتبر حضرات نے باہم مشورہ کرکے، چندہ جمع کیا،اور مرمّت کروائی تھی۔ اِردگرد وِلایتی ببولوں کا اس قدر جم گھٹ تھا،اُسے بھی کٹوایا تھا۔لوگ صدیوں سے اس کے میٹھے،شفاف اور ٹھنڈے پانی سے اپنی پیاس بجھاتے آئے تھے۔ بلاشبہ یہ باوڑی علم ہیئت کی بے مثال یادگار ہی نہیں تھی بلکہ قصبہ والوں کے لئے سرمایۂ افتخار بھی تھی، جسے مندر آنے والا ہر معتقد، دیکھنا نہیں بھولتا تھا۔

--

یہاں کی حویلیوں میں بھی باوڑیاں تھیں۔ پنڈت بشن سنگھ کی حویلی میں تو دو تھیں مگر پانی،ایک میں ہی تھا۔ان کے زینے اتنی گہرائی تک اُترے ہوئے تھے کہ کوئی بھی بندہ پانی اوپر

لاتے لاتے تھک جائے۔۔ مگر وہ دو ملازمائیں۔۔ روئی اور دھوئی، اودے، پیلے رنگ کے گھاگرے اور گلابی لوگڑے میں لپٹی ایسے ٹھمک ٹھمک کر پانی لاتیں کہ گھر کے مردوں کو شرابور کر دیتیں۔۔ گھونگھٹ اتنا لما کہ کیا مجال جو کچھ نظر آ جائے۔ پنڈت رتن سنگھ کے دونوں چھوٹے بھائیوں کی لاکھ کوشش رہتی کہ کچھ دِکھ جائے، کبھی اُن کی اس کوشش کو رتن سنگھ بھانپ لیتے تو، دونوں چھوٹے بھائیوں پر ایسی قہر آلود نظریں ڈالتے کہ دونوں ہی بدک کر اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ مگر پھر رتن سنگھ خود اس کوشش میں لگ جاتے۔ اور اُن کی نظریں گھونگھٹ سے اُتر کر، دونوں ملازماؤں کی سانولی، چکنی، گول گول پنڈلیوں پر ٹھہر جاتی کہ جن پر پانی کی ایک بوند بھی نہ ٹھہرتی۔ رتن سنگھ کو ان دونوں کا وجود شبنمی سا لگنے لگتا۔ انہیں جھرجھری آ جاتی۔۔ اور انبساط کے دریا میں، وہ غوطے کھانے لگتے۔ لیکن پھر جلدی ہی تا کا جھانکی کے اس کھیل کو انھیں چھوڑنا پڑتا اور اِردگرد چور نظروں سے دیکھ کر، وہ جنیو ہاتھ میں لے کر، جلدی جلدی اُسے سُوتنے لگتے۔۔۔ ان کی سانسیں تیز ہو جاتیں۔ اور وہ بے اختیار تیز تیز قدموں سے چل کر مردانے کا رُخ کر لیتے۔۔ ایک مخصوص آواز میں نندو رآم کو زور سے پکارتے، وہ دوڑا دوڑا، ہاتھ میں بادام روغن کی شیشی لئے چلا آتا اور مضطرب مالک کو راحت پہنچانے کی کوشش میں لگ جاتا۔ ''ٹھالا بُلا (گالی ہے)، کئی کر ریو ہے، جوٗر لگا، حرام رَو کھا رِیو ہے'' (کیا کر رہا ہے، زور سے ہاتھ چلا، نمک حرام)۔ وہ گہری گہری سانسوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کیا کرتے۔ پنڈت بشن سنگھ، جنہوں نے مردانے کے دہرے دالان میں، ایک طرف اپنا ڈیرہ جمایا ہوا تھا، بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر منہ پھیر لیتے۔۔ انہیں اتنی کھانسی اٹھتی کہ بلغم کے ساتھ کبھی کبھی خون بھی آ جاتا۔۔ باپ کی کھانسی کی یہ آواز رتن سنگھ کے کانوں میں سیسہ گھولنے لگتی۔ وہ بڑبڑاتے۔۔۔ ''خود نے تو جوانی میں خوب گُل۔۔۔ اور آج۔۔۔ زور سے رگڑ ٹھالا بُلا۔۔۔ تُو بھی کسی کام کا نہیں۔۔۔ ہاں، ایسے۔۔۔''!!

''چھوٹا منہ بڑی بات مالک۔۔ گھر کی کھر پتوار ہے، حُکم کیجئے، جب چاہیں، اُکھاڑ لیں''۔ نندو رآم سرگوشی سے پیٹھ پر رگڑا مارتے ہوئے کہتا۔ لیکن پنڈت جی سے کوئی جواب نہ بن پڑتا اور وہ

کسمسا کر رہ جاتے۔۔ ''دیکھ جیونہ اُترنے پائے۔۔۔ سنبھال کے''۔۔ وہ نندو کو ہدایت کرتے۔ دونوں بھائی اُن کی یہ کیفیت چوری چھپے دیکھتے تو، آنکھوں سے ایک دوسرے کو جھپکی مار کر زیرِ لب مسکرا اُٹھتے۔

کھسر پُسر ہوتے ہوتے جب یہ خبر زنان خانے تک پہنچتی تو، سہدرار آئی، ٹھنڈا سانس بھر خلاء میں نہ جانے کیا دیکھنے لگتیں کہ دادی انہیں دیکھ کر سہرا اُٹھتیں۔۔۔ اُن کی انگلیاں مالا پر جلدی جلدی پھرنے لگتیں۔ جاپ کرتے کرتے ملازماؤں پر اُن کی تجربہ کار آنکھوں کی نگرانی اور بڑھ جاتی۔۔ اُن کے گھونگھٹ اور لمبے کروادئے جاتے۔۔ چال کی لچک پر صلوتیں سنائی جاتیں۔۔ بات بے بات ٹوکا ٹوکی کی جاتی اور اس میں اضافہ ہوتا ہی چلا جاتا۔۔ لیکن تعجب اس بات پر ہوتا تھا کہ اتنے لمبے گھونگھٹ لینے کے بعد بھی وہ کبھی ٹھوکر نہیں کھاتی تھیں۔ شریر، الھڑ روپ کنور کبھی کبھی اُن کی نقل اتارتی، تو دادی گھُرکی دیتیں۔

''ارے بٹو۔۔ یہ کیا کرتی ہے۔ کس کی نقل اُتار رہی ہے۔۔ ار۔۔۔ ار۔۔۔ ار۔۔۔ دیکھ سنبھل کے۔۔۔ کیا کیا ناٹک کرتی رہتی ہے۔ دیکھا ابھی اوندھے منھ گر جاتی تو دانت ٹوٹ جاتے نہ۔۔۔ پوپلی سے پھر کوئی بیاہ ہی نہیں کرتا''۔۔ اور خود دادی کی پوپلی باچھیں پھیل جاتیں۔۔ بٹو کل کل، جھرنے جیسی ہنس پڑتی اور ہنستے ہنستے کہتی۔۔ ''ارے دادی! یہ روئی دھوئی اتنے لمبے گھونگھٹ میں نہ جانے سب کام کیسے نبٹا لیتی ہیں۔ ذرا کر کے دیکھ رہی تھی''۔ روپ کنور اپنے آپ کو سنبھالتی اور دوپٹے کو سر سے ہٹا کر، شانوں پر ڈال کر، خاص ادا سے بولتی۔

''نہ بابا نہ، بڑا مشکل ہے۔ بے چاریوں پر کیسی پہرے داری ہے''۔

''نوکروں کے بارے میں اتنا نہیں سوچا کرتے۔ ان کی تو عادت پڑ جاتی ہے''۔ دادی آنکھیں تریر کر دھوئی کو آواز لگاتیں۔

''دھونی۔۔۔ او دھونی۔۔۔ اری کہاں مر جاتی ہے۔۔ ادھر آ۔۔''۔

''دھونی۔۔۔ او دھونی۔۔ کہاں مر جات۔۔۔ تی۔۔'' دادی روپ کنور کا کان پکڑ لیتیں۔ اب

میری نقل بھی اُتارنے چلی ہے۔شیطان کی خالا۔۔میں بتاؤں تجھے''۔۔یہ کہہ کر وہ ہوا میں ہاتھ لہراتیں کہ روپ کنور کی کھنکتی ہنسی، حویلی کی بوجھل فضا کو شگفتہ کرتی چلی جاتی۔۔۔اور وہ اُچھلتی کودتی کمرے سے باہر نکل کر اپنے چھوٹے بڑے، چچازاد بھائیوں کی ٹولی کے ساتھ غائب ہو جاتی۔۔ بچوں کا یہ ٹولہ ہی تھا، جس سے گھر میں رونق ہو جایا کرتی۔۔پھر کبھی یہ ہوتا کہ چاروں بھائی مردانے میں اپنے دادا کے پاس چلے جاتے، مگر روپ کنور کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔بشن سنگھ کبھی کبھار زنانے کا رُخ کر لیتے، تو پوتی کو دیکھ لیتے۔۔ورنہ وہ دادا کی شفقت سے محروم ہی تھی، البتہ اُسے اس محرومی کا احساس تھا نہیں، کیونکہ رواج ہی یہی تھا۔۔پھر ایسے لوگوں میں جذبے بھی معمول کے مطابق ڈھل جاتے ہیں۔۔بچوں کو نہ تو زیادہ ضدیں کرنے کی اور نہ زیادہ شرارتیں کرنے کی اجازت تھی۔کچھ اس ترکیب سے انہیں بہلایا، پھسلایا جاتا تھا کہ ایک بات کو وہ دوبارہ دہراتے ہی نہیں تھے۔لیکن بچپن تو بچپن ہی ہوتا ہے، ضد کر ہی لیا کرتا ہے۔۔بچوں کا یہ ٹولہ کھیلتے کھیلتے اکثر اُس کمرہ میں جانے کی ضد کر بیٹھتا، برسوں سے بند پڑا تھا۔

حویلی کے پھاٹک کے پاس ایک کونے میں بنے اس کمرہ میں زنگ آلوُد تالا لٹکا رہتا۔۔وہیں پاس لگا ہوا پاخانہ بھی تھا۔اُس میں بھی کوئی نہیں جاتا تھا۔پاخانے کے باہر ایک طرف دو تین پُرانے مٹکے لڑھکے پڑے رہتے۔۔۔اشتیاق اور تجسس بچوں کا فطری عمل ہے۔۔ چنانچہ روپی اکثر ماں سے سوال کر بیٹھتی۔۔۔

''ماں وہ رُوم بند کیوں رہتا ہے۔وہاں پہلے وہ بوڑھی تائی رہتی تھیں نا۔۔وہ کہاں گئیں۔۔ اُسے کھول دو ماں۔۔۔ہم وہاں کھیلیں گے۔۔۔''۔

''بٹو۔۔دماغ مت چاٹا کرو۔۔۔تمہارے کھیلنے کی بُہتری جگہ پڑی ہے۔تمھیں اس کمرہ سے کیا۔۔اس میں کباڑ بھرا ہے''۔یہ کہہ کر وہ ادھر اُدھر ہو جاتیں۔۔روپی چُپ تو ہو جاتی لیکن مطمئن ہرگز نہیں۔۔اُسے رہ رہ کر بوڑھی تائی یاد آتیں۔''

وہ کوئی دس بارہ سال کی رہی ہوگی۔ایک بوڑھی تائی ہوا کرتی تھیں۔گھر بھر کا سارا کام

ان کے ذمہ تھا۔ جھاڑو، پونچھا، برتن، کپڑے۔۔۔روپی دھوتی تو اُس وقت خود چھوٹی تھیں۔ وہی زیادہ تر کام سنبھالے ہوئے تھیں۔ مگر سب سے الگ تھلگ اُس کمرہ میں نہ جانے کیوں رہتی تھیں۔ روکھا سوکھا کھاتیں، تو روپی کا ننھا دل سوال کرتا۔۔۔''ماں، انہیں اپنا کھانا کیوں کھانے نہیں دیتیں؟'' ماں ہمیشہ کی طرح ٹال دیتیں یا جھڑک دیا کرتیں۔۔۔روپی کو وہ بہت اچھی لگتی تھیں، لیکن اُن کے کپڑوں کا رنگ اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ مٹ میلا، عُنابی سا۔ بالکل خون کے پُرانے داغوں جیسا۔۔۔ پر، بوڑھی تائی کی سفید بھنویں۔۔۔سفید پلکیں اور شفقت آمیز نظریں اُسے بے حد پسند تھیں۔۔۔ اور اُن کا گانا۔۔۔ بڑا ہی درد بھرا ہوتا تھا۔ گڈّے سے دور، گڑیا کے آنسوؤں کی طرح۔۔۔روپی پوچھتی تو دادی کہتیں۔۔۔

''وہ جھورا وا'' (بیوہ کے لوک گیت، اس میں اس کا کرب بیان ہوتا ہے) گاتی ہیں۔ جب بھی دادی کا دل چاہتا، انھیں کمرے میں بلا لیتیں۔ وہ سارا کام، نبٹا کر، دادی کے پاس آ جاتیں۔ ان سے بڑی اچھی باتیں کیا کرتیں۔ مگر دور زمین پر بیٹھ کر۔۔۔گھر بھر میں سب اُن کی عزّت تو کرتے، لیکن ہمدردی کوئی نہیں کرتا تھا۔۔۔ان تمام باتوں کو، تھوڑا بہت، جتنا بھی تھا، روپی سمجھ ہی لیتی تھی، اور اُسے یہ طریقہ سخت کھٹکتا مگر وہ سوال کرنے کی ہمّت نہیں جُٹا پاتی تھی۔

برتن، بوڑھی تائی بہت اچھے مانجھا کرتی تھیں۔ چماچم کر دیتی تھیں۔۔۔روپی اپنی تھالی میں اپنا چہرہ دیکھتی اور خوش ہوتی۔۔۔تو وہ بھی خوش ہو جایا کرتیں۔۔۔اور پھر رگڑ رگڑ کر اُس کی تھالی کو اور چمکانے کی کوشش کرتیں۔۔۔۔لیکن پھر ایک دن وہ غائب ہو گئیں۔۔۔تو گھر کے معمول میں کوئی فرق بھی نہیں پڑا۔۔۔پھر جلدی ہی انہیں سب بھول بھی گئے۔۔۔روپی کی تھالی میں اب اُسے اپنا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔۔۔ وہ دھندلا گیا تھا۔۔۔ وہ بوڑھی تائی کو، اکثر یاد کر پوچھا کرتی۔

''دادی، وہ باہر کا 'نشارا' سُونا کیوں پڑا رہتا ہے۔ اُس میں باتی کیوں نہیں بھرتے۔ روتی، دھوتی اُس سے برتن کیوں نہیں مانجھتیں۔۔۔بوڑھی تائی کی طرح۔۔۔وہ اُس طرف اشارہ کر کے پوچھتی، جہاں بوڑھی تائی کھانستے کھانستے، چوکور بنے تھانولے میں بھری، چھینے کی راکھ سے رگڑ رگڑ کر برتن

مانجھا کرتی تھیں۔۔ باورچی خانہ سے دور، حویلی کے دروازے کی ایک جانب، اُس کوٹھری کے پاس۔۔۔ بنّو کو کبھی سمجھ نہیں آتا کہ آخر بوڑھی تائی اُس چوکور احاطے میں، جسے سب ''نشارا'' کہا کرتے تھے، برتن کیوں مانجھتی ہیں۔ کتنی مشکل سے، کئی پھیروں میں، رَسوئی سے وہ جھوٹے برتن اٹھا کر وہاں تک لے جاتیں اور پھر دھو کر، اُسی طرح لاتی بھی تھیں۔۔۔ دادی کہتیں۔۔

''بنّو۔۔ اُس نشارے کی بانی سے کوئی برتن نہ مانجھے۔۔۔ یہی اچھا ہے۔۔ میری بچّی۔۔۔ تو جا! کھیل۔۔ کیوں اُلٹے سیدھے سوال کیا کرتی ہے۔۔۔ دادی چڑ جاتیں۔ بنّو دیکھتی کہ وہ فوراً مالا کے دانوں کو تیزی سے پھرا پھرا کر، دادا کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگنے لگتیں۔۔۔ بنّو بڑی اُلجھن میں گرفتار ہو جاتی۔

زندگی بس، اسی طرح ان ننھوں کی شرارتوں، اشتیاق بھرے سوالوں اور جھوٹے سچے جوابوں کے محدود دائروں کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ بچّے بڑے ہو رہے تھے۔ پریم سنگھ کو شہر کے میڈیکل کالج میں داخلہ دلوا دیا گیا تھا۔ انوپ اور مہندر اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ اور پرتاپ نے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ وہ یا تو دیوی کرنی ماتا کے مندر میں پوجا اَرچنا میں مگن رہتا یا اپنے تایا پنڈت رتن سنگھ کے ساتھ رہ کر تنتر منتر ودھیا سیکھتا اور پوتھیوں میں سر کھپاتا۔ روپی بھی کبھی کبھی گھر بھر کی زنانیوں کے ساتھ، خاص خاص موقعوں پر ہونے والی پوجا میں شریک ہوتی۔ بڑی عقیدت سے وہ دیوی کی مورتی کے بالکل قریب جا کر، سب سے آگے کھڑی ہو جاتی۔۔۔ دیوی کے کرشمے اور معجزے کے واقعات، جو بچپن سے سنتی آ رہی تھی، اُسے تقویت دیتے۔ ''دیوی ماں۔۔ میں بھی تمہاری طرح لوگوں کے دکھ درد دور کرنا چاہتی ہوں، کچھ کر دکھانا چاہتی ہوں۔ مجھے شکتی دو ماں۔ شکتی دو''۔۔ اور وہ دیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی تو، اُسے سچ مچ ایسا لگتا، جیسے نُور کی کرنیں، اُس کی رُوح کو توانائی بخش رہی ہیں۔۔۔ بچپن سے لے کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے تک، یہی توانائی وہ حاصل کرتی آئی تھی۔ اور نئے جوش و ولولے کے ساتھ علم کے میدان میں، کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ بھی اپنے بڑے بھائی پریم سنگھ کی طرح ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ قصبہ کے

لوگوں کی اُسے فکر تھی۔ بھیرو کی بیوی ڈاآلی کا وقعہ وہ بھولی نہیں تھی۔ طبی مدد کا نہ ہونا اور باپ دادا کے ذریعے کرائے جانے والے تنتر منتر، جھاڑ پھونک، جادو ٹونوں سے لوگوں کو بے وقوف بنا کر پیسہ وصولنے کا عمل اُس کی سمجھ میں اچھی طرح آنے لگا تھا۔۔اور یہ وصولی اُس کی داخلیت کو ریزہ ریزہ کردیتی تھی۔۔ایک آدھ مرتبہ اُس نے اس استحصال کا ذکر، اپنی ماں سے کیا بھی تھا، ماں نے ایسی ڈانٹ پلائی۔۔۔اور اس کے متعلق ہمیشہ چپ رہنے کی سخت تاکید کی کہ پھر دوبارہ اس نے کوئی سوال تو البتہ نہیں کیا، لیکن دل ہی دل میں ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کر، اس شکنجے سے قصبہ والوں کو آزاد کرانے کا عزم کرلیا۔اس عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اُسے ماتا کے آشیرواد کے ساتھ اپنی پھوپی پر بھی پورا بھروسہ تھا کہ وہ ضرور اُس کی مدد کریں گی۔۔۔وہ بھی اُن کے ساتھ شہر جا کر، اپنے بھائی کی طرح ڈاکٹری پڑھے گی۔

لیکن خاندانی وراثتوں کی قید میں گھرے حویلیوں کے پُرشکوہ درودیوار، حوصلوں کی بلندیوں سے، کہیں اونچے اور سخت تھے۔جن کی بندشوں اور جکڑ بندیوں سے کیا مجال، جو کوئی آزاد ہو جائے۔۔روپی کے حوصلوں کو بھی قید کردیا گیا تھا۔

پھوپی کی ایک نہ چلی۔۔ماں کی ایک نہ چلی۔۔انھوں نے چلائی بھی نہیں۔۔شاید، وہ سب سے زیادہ سمجھدار تھیں۔رتن سنگھ بھی بیٹی کے حوصلوں سے واقف تھے، فروغ بھی دینا چاہتے تھے، لیکن خاندانی وقار نے اُن کو بیڑیاں پہنا رکھی تھیں۔۔روپی کو ڈاکٹر کی جگہ، دُلہن بننا پڑا۔ بالکا بُدھو کے ہاتھ پیروں کی سُرخ مہندی اور ماتھے کی بندیا، اُس کے ارمانوں اور خوابوں کے وہ دہکتے انگارے ہی بن گئے کہ جس کی تپش میں اُس کا وجود سکڑ سا گیا۔ گُٹھری، مُٹھری دلہن بنی وہ شاید یہی سوچ رہی تھی کہ اے میری زندگی۔۔۔تُو نے مجھے آج ایسے دوراہے پر لاکر کیوں کھڑا کردیا، جہاں سے میں اُس آزاد پنچھی کی مانند پرواز کرنا چاہتی ہوں، جو دُور خلاؤں میں، بے فکر و دلشاد، ہوا کے دوش پر اُڑتا چلا جاتا ہے۔مگر کیا کروں میری ڈالی ہوئی یہ بیڑیاں، یہ سلاسل، میری پروازِ فکر پر بھی قدغن لگادیتے ہیں۔

''کتنی سُندر لگ رہی ہے۔ کالا ٹیکا تو لگادو کوئی''۔ سکھیوں کا ایک ٹولہ آیا اور چُہل کر گیا۔ روپی کا انہماک زائل ہوا۔ اس نے خالی نظروں سے اُن کی طرف دیکھا اور بے مطلب مسکرائی۔ پھر کسی بوڑھی بوڑھی نے بڑھ کر دلہن کا گھونگھٹ یہ کہتے ہوئے لمبا کردیا کہ بارات آنے والی ہے، ٹِر ٹِر دیکھنا بند کرو''۔ تو اُس نے بڑی سعادت مندی سے فوراً گردن نیچی کرلی۔ خیالات پھر ایک مصنوعی جہاں کی سیر پر لے گئے۔۔ ''یہ کیسی گھڑی ہے۔۔ یہ کیسے حالات ہیں۔۔ حالات کی نوعیت اس قدر پیچیدہ اور عُجلت طلب کیوں ہے؟ کیوں، مجھے تخیل کی اس سہانی دنیا سے۔۔ جہاں میرا مستقبل تاروں کی جھلملاتی فضاؤں میں پروان چڑھ رہا تھا۔۔ خداؤں کی اس دھرتی پر۔۔۔ کشاکش کے اس جہان میں۔۔۔ تاراج کر۔۔ تگ ودَو کے لئے لاکھڑا کیا ہے۔۔۔ کیوں یہ سوز وتب وتابش کی آغوش سے کھینچ کر۔۔۔ تنہا آواز کی سکت کے ابلتے چشموں کو پرکھنے میں لگے ہیں۔۔۔ کیوں یہ مجھے تذبذب کے شَررزار میں تیرا اصلی رنگ، اصلی روپ دِکھا رہے ہیں۔۔ کیوں۔۔۔ اے زندگی؟۔۔ کیا یہی ہے تیرا اصلی رنگ وروپ؟؟

بارات آگئی، بارات آگئی۔ دیکھو آکاش میں رنگ برنگے گولے پھوٹ رہے ہیں۔ کیسی آتش بازی ہے، جھلملاتے تاروں جیسی۔۔۔ دُوار پر دُولھا ''تورَن'' کی رسم پوری کر رہا ہے۔ کتنی سُندر جوڑی ہے۔ اب جلدی ہی پھیرے ہوں گے۔۔۔ کیسا بڑھیا منڈپ سجا ہے''۔۔

اور پھر روپی، شادی کے پھیروں کے چکّر میں پڑ گئی۔ اُس کی چُنری کو، خوش وضع وجے سنگھ کے شانے پر جھولتے ہوئے ''انتر واسا'' سے باندھ دیا گیا۔ گویا اس بندھن میں یہ جذبہ بھی کارفرما تھا کہ روپی اپنے پیا سے ہی نہیں بلکہ تمام اہلِ خاندان سے، اپنی سنسکرتی سے عہد وپیا کررہی ہے۔ پنڈت جی کے شلوک اس کی تصدیق کررہے تھے۔ پوِترا گنی، اس کی ساکشی تھی۔ وداعی کی گھڑی آئی اور روپ کنور پرتاپ پور کے راج پروہتوں کی حویلی کی شان بڑھانے پہنچادی گئی۔

سترہ سال کا نازک سا سراپا۔۔۔ معصوم سا اُجلا اُجلا۔۔۔ گھنیرے بال، ہرنی سی

چال، گڑیا ساچہرہ، ڈب ڈب کرتی پیاری سی آنکھیں، گال پر سُرخی، سُرخی کے ہلکورے، ہلکوروں میں گہرے گہرے گڑھے۔ گڑھوں میں شوخی کے بھنور۔۔اور بھنور میں ڈوبتا تیرتا، اُس کا وجود۔۔ایک چہکتی، ہُلکتی باعزم وجرأت شناور کی پرواز کو کُل کی لاج رکھوانے کے بھاری بھرکم تقاضوں کے بوجھ تلے بے دردی سے دبادیا گیا۔ بڑی حویلی، بڑے لوگ، بڑی شان و شوکت۔۔۔!!

--

(باب۔۴)

یہ حویلیاں بھی ایک معمہ ہوتی ہیں۔ باہر سے دیکھو تو شان وشوکت کا پلندہ اور اندر سے پھوٹے نصیب۔۔ راج کنور نے گہری سانس بھری، اور غور سے مُرغے کی بانگ سُنی تو مسہری سے اٹھتے ہوئے وہ بُدبُدائیں۔۔۔ ''ہونہہ۔۔ بانگ کیا ہے۔۔ مُردنی سی صبح کا اشارہ''۔۔ کہ اچانک بُدبُدانہ بند کر کے، سانس روکی، اور کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگیں۔ بانگ کے ساتھ کچھ دبی گھٹی، پھُسپھساہٹ بھری دیگر آوازیں بھی انہیں سنائی دیں۔ راج کنور کے کان کھڑے ہو گئے۔۔ یہاں کیا ہو رہا ہے۔۔۔ سب کچھ اتنا گُپ چُپ۔۔ اتنا خفیہ۔۔ آخر یہ کس کی آواز ہے۔۔۔ دیکھوں تو سہی۔۔ میری روپی''۔۔ اُن کا دل بے ساختہ دھڑکا۔ وہ مسہری پر سے اٹھیں۔۔ گرم شال اپنے شانوں پر ڈالا، اور چپّل پہن کر کمرہ سے باہر آئیں۔ پہلی منزل پر بنے مہمان خانے کے اس کمرہ سے حویلی کی پھاٹک کا رُخ صاف دکھائی دیتا تھا۔ جہاں معمول کے مطابق وہی بوڑھی تائی والی بوسیدہ کوٹھری اپنی قسمت پر آنسوں بہاتی، شکستہ درو دیوار لئے کھڑی تھی۔ ''اُف''۔۔ انہیں اپنے میکے کا یہی نقشہ یاد آ گیا۔ کرب اور غصہ سے انہوں نے گردن کو جھٹکا دیا اور غور سے اُس طرف دیکھا، جدھر سے کھُسر پُسر کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اُس کوٹھری کی مدّھم سی روشنی میں سے سکڑا سکڑایا ایک سایہ باہر نکلا، اور چند قدم چل کر غائب ہو گیا۔ انہیں خوف سا محسوس ہوا۔ تجسّس بھی بڑھا اور پاؤں اس جانب بڑھتے ہی چلے گئے۔ سیڑھیاں اُتر کر جب وہ اُس احاطے میں پہنچیں تو چھاتی شق ہو گئی۔۔ سَر جھاڑ، منہ پہاڑ۔۔ نرم و نازک پاؤں میں ٹائر سے بنے دو پٹّے والے کالے بھدّے جوتے پہنے، اُن کی روپ کنور ابھی ابھی پاخانے سے باہر نکلی تھی۔ اور وہیں رکھے پُرانے مٹکے سے پانی نکال کر ہاتھ دھو رہی تھی۔

اُن کا دل تھرّا گیا۔ ''ہائے یہ ''انوٹھی'' (ٹائر سے بنی چپل۔ ڈھائی تین روپے کی آتی ہے۔ پہلے ڈیڑھ کی آتی تھی۔) اب تک ان کے یہاں پہنائی جاتی ہے''۔۔ اُن کے ذہن میں روپی کے درجنوں جوڑی جوتے گھوم گئے۔۔ جس میں زیادہ تر شہر سے لاکر انھوں نے اُسے دیئے تھے۔

کہاں وہ قیمتی زری دار جوتیاں اور کہاں یہ ڈیڑھ روپئی کی انوٹھی۔ وہ اوٹ میں ہوخاموشی سے، بڑے باغیانہ انداز میں سامنے کا منظر دیکھنے لگیں۔۔ ایک گنجی، پھونسی بوڑھی عورت، سفید ملگجی مل مل کی ساڑی میں ملبوس، روپی کے پاس کھڑی اس کے ہر عمل پر پینی نظر رکھے ہوئے تھی۔ روپی نے ہاتھ دھوئے، منھ پر پانی کے چھینٹے دیئے اور وہیں کھڑے کھڑے اپنی اوڑھنی سے چہرے کو خشک کیا۔

''افسوس! کیا منھ اُتر گیا بچی کا۔۔ رنگ دیکھو، زرد پڑ گیا۔ چچ''۔ اتنے میں انہوں نے دیکھا، بُڑھیا نے ایک پیالہ روپی کے آگے کر دیا۔ اُس نے پھر اُسی مٹکے سے پانی لے کر، اُس پیالے میں پڑی کسی چیز میں ڈالا۔ اور دو منٹ کے بعد کھڑے کھڑے ہی گُو گُو کر کے اُسے چبانے لگی۔

راج کنور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔'' یہ کیا۔ آج بھی یہ ظلم۔ اور وہ بھی ان کی نازوں کی پلی روپی پر۔۔ اب سمجھ میں آیا۔۔۔ دستور کے مطابق گیارہ دن تک اُسے یہی سُوکھی روٹی، پانی میں بھگو بھگو کر کھلائی ہوگی۔ تبھی تو کیسی پیلی چمڑی نکل آئی۔'' وہ تو دہل گئیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً اوٹ سے باہر نکلیں، جھپٹا مار کر روپی کے ہاتھ سے پیالہ لیا اور دے مارا زمین پر، پھر روپی کا ہاتھ پکڑ، اُسے تقریباً دھکیلتی ہوئی اپنے کمرے میں لے جانے لگیں۔ انہیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ یہاں ایک مہمان کی حیثیت سے ہیں۔ اور وہ بھی لڑکی والوں کی طرف سے۔

بُڑھیا کی توقع کے خلاف سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ اوّل تو وہ کچھ سمجھی ہی نہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے، لیکن جب اُس کے حواس درست ہوئے تو اُس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ روپی کی ساس شاید جاگ رہی تھیں۔ فوراً اپنے کمرہ سے نکل، احاطہ کی جانب آ گئیں اور جب انہوں نے یہ

سب دیکھا، سمجھا تو فوراً طیش میں آگئیں۔ بھری تو بیٹھیں ہی تھیں۔ برسنا شروع کر دیا۔ ''سگی جی (سمدھن جی) کل سے دیکھ رہی ہوں، آپ ریتی رواجوں کی پرواہ کیئے بغیر اُتر تھ پہ اُتر تھ کیئے چلی جا رہی ہیں۔ اوڑھنی لانے کا رواج آپ نے توڑا۔۔ نہ باپ، نہ بھائی۔۔ چلے آئے بُوا اور چاچا۔۔ پھر کیسا تیکھا رنگ لے کر چلی آئیں۔۔ ہم یہ کیسے اُڑھا دیں۔۔۔ کیا آپ جانتی نہیں، بیواؤں کو تیکھے رنگوں سے دور رکھا جاتا ہے۔ ارے اگر بھدّا رنگ نہیں مل رہا تھا تو ہم سے کہہ دیتیں، ہم منگوا دیتے'' انہوں نے نشتر پہ نشتر چھوڑنا شروع کر دیئے۔

''سگی جی! آپ دھیر یہ رکھیں، میری بات تو سُنیئے''۔ راج کنور نے بات بگڑتے اور روپی کو کانپتے دیکھا تو، اپنے غصّے پر قابو کیا۔

لیکن روپی کی ساس تو جیسے ٹھانے بیٹھی تھیں کہ آج سارا زہر اُگل دیں گی۔ انہوں نے راج کنور کو نرم پڑتے دیکھا تو پھر شیر ہو گئیں۔

''کیا خاک سُنوں آپ کی۔۔ اپنی باتیں اپنے پاس ہی رکھو۔ نئے زمانے کی نئی باتیں ہمیں نہیں سُہاتیں۔۔ لو بھلا مجھ سے کہتی ہیں کہ انہوں نے گنجی بڑھیا کو مخاطب کر کے کہا۔۔ ''روپی کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔۔ نہ اماوس کی رات نہ اندھیرا بگ کی رسم۔۔ چلی آئیں دن دہاڑے بیوہ کو لینے۔۔ نہ پردہ نہ زردہ۔۔ حویلی سے بیوہ باہر جائے گی تو دن کے اُجالے میں، دَس کی نظر اُس پر پڑے گی کہ نہیں''۔۔ اب پھونسی بڑھیا میں بھی تحریک پیدا ہو گئی۔۔ آنکھیں مٹکا کر مصنوعی حیرت سے اپنے پوپلے منہ سے اُس نے جلتی آگ میں گھی ڈالا۔

''اے بائی! کیسو جمانوں آگیو، نہ لوک نہ لاج۔۔۔ پھر لوگاں رے گھروں سُبھ کام ہویں۔۔ یوں دن رے اُجیالے میں اس اَشبھ ری چھانیہ اُتر پر پڑ جاوے لی تو گُنڑ جواب دیتا پھرے لا۔ اِجت ہی مٹی میں مل جاوے لی۔۔''''!

''اے مائی، تو اندھیرے بگ کی بات کرتی ہے، یہ تو چاندڑے میں ہی نہیں بلکہ گیارہویں دن، دن دہاڑے لے جانے کی بات کہہ رہی ہیں۔۔ لوگ بھلا تھوکیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے''۔۔

انہوں نے بُرا سامنہ بنا کر، سیدھے پلّے کی سُرخ ریشمی ساڑی کے پلّو کو اُلٹے ہاتھ کے جھٹکے سے سر پر آگے کی طرف سرکا، آنکھیں تریر کر روپّی کے بازو کو پکڑا اور تقریباً اُسے گھسیٹتے ہوئے دانت بھینچ کر کہا۔

''اب اس سے اس کل مؤہی رانڈ کو کہاں لئے جا رہی ہو۔ آرام میں رکھ کر کیا اس کے سوئے ہوئے اُرمان جگانے کا پھر سے ارادہ ہے؟''۔۔۔ آنکھوں میں خوف لئے روپّی اب گیند کی مانند ہوگئی کیونکہ اب دوسرا بازو پکڑ کر پھوپی اپنی طرف اُسے کھینچ رہی تھیں۔۔۔ وہ کبھی اس پالے میں ہوتی، کبھی اُس پالے میں۔۔ آخر ساس نے بازی مار لی۔۔ اور بہو کو پھر سے کوٹھری کی جانب دھکیلتے ہوئے بڑبڑانے لگیں۔

''یہ اسی کوٹھری میں رہے گی، بھلا یہ کس کھیت کی مؤلی ہے، میری دادی ساس بھی یہیں رہیں۔ ساسو جی کا ٹھور بھی یہی تھا۔ پھر اس میں کون سے سُرخاب کے پر لگے ہیں۔ صدیوں سے ہمارے پُرکھے یہ سب کرتے چلے آرہے ہیں۔۔ پھر اس رانڈ کے ساتھ ہم بھی تو اپنے کرموں کو بھوگ رہے ہیں، آج پورے بارہ دن ہوگئے۔ انہوں نے لہجہ بدل کر فوراً مسکینوں والے انداز میں کہا۔

''اُبلا کھاتے کھاتے۔۔۔ دیکھو میری کیا حالت ہوگئی''۔۔ انہوں نے نہ جانے کسے اپنی موٹی بانہہ دکھائی۔۔۔ اور خود ہی اپنے آپ پر ترس کھایا۔۔'' آتے ہی ڈاکن دو ہی مہینے میں میرے بیٹے کو کھا گئی۔ اب اور کھانے کو کیا بچا ہے۔۔ اَبھاگن سے کہا تھا، ستی ہو جا۔ نشہ کر کے بیٹھ جاتی چِتا میں۔۔ پتہ بھی نہیں چلتا۔۔۔ ایک ہی بار میں پاپ سے چھوٹ جاتی۔۔۔ سیدھے سُورگ ملتا۔۔ نہیں مانی۔۔۔ ہٹ دھرمی۔۔۔ اب تِل تِل کر مرتی رہ، سارا جیون''۔ یہ کہہ انہوں نے حقارت سے روپّی کو کوٹھری کے اندر دھکیل دیا۔۔ وہ اتنی ڈر گئی تھی کہ چال چلنا بھی بھول گئی۔۔ گرتے گرتے بچی۔۔ چپ چاپ، جیسے تیسے ڈرے سہمے قدموں سے کوٹھری کے ایک کونے میں جا، چہرہ دیوار کی جانب کر، گٹھری بن کے بیٹھ گئی، جیسے کینچوا سکڑ کر بے جان ہو جاتا ہے۔

اُس کی اس حالت کو دیکھ کر راج کنور کے باغی من نے ہار مانتے ہوئے اُن سے یہ جملے

کہلوائے۔

''سگی جی، آپ نہ جانے کیا کیا کہے جا رہی ہیں۔ ہمیں کہہ لو، جو کہنا ہے، پر اس معصوم پر ظلم نہ کرو۔ یہ بیوہ ہو گئی تو بھلا اس میں، اس کا کیا دوش۔۔ تنک وچار تو کرو۔۔۔ یہ بھی جیو ہے۔ یدی اس کا پتی سُورگ واسی ہو گیا تو اس میں روپی کیا کرے۔ اُس پر تو خود دُکھ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا''۔

''روپی کا کیا دوش، روپی کیا کرے''۔ روپی کی ساس نے راج کنور کی نقل اُتار، ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔۔ ''دوش دوش اور کسی کا نہیں، ہمارا ہی تھا، جو آپ کے خاندان میں رشتہ کیا اور نرک کے بھاگی بنے۔ دَھرم بھرشٹ کر ڈالا، سارا کا سارا''۔ انہوں نے بڑی نفرت سے انہیں دیکھا۔

دونوں سمدھنوں کے اس عمل، ردِ عمل نے اب جھگڑے کا رُوپ لے لیا تھا۔ شور سن کر سُدرشن سنگھ اور روپی کے سُسَر پنڈت شورویر سنگھ بھی آ گئے۔ بات بگڑتے دیکھ دونوں نے مداخلت کی۔ شورویر سنگھ کچھ کہتے اس سے قبل سدرشن سنگھ نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ، کمر کو خم کر، درخواست کرنے والے انداز میں سمدھن سمدھی سے کہا۔۔ ''یہ سمے بات بڑھانے کا نہیں۔ روپی کا ہت اسی میں ہے کہ کُل کی ریت نبھائی جائے۔ آپ یہ اوڑھنی سُویکار کریں۔ ہم ڈیڑھ ماہ بعد اماوَس کی رات اپنی بیٹی لینے آ جائیں گے۔ ریتی رواجوں کو ہمارا کُل بھی مانتا ہے۔ اب جو بھگوان کی مرضی۔۔۔!

حالات کے سامنے بھائی کو اس طرح ہتھیار ڈالتے دیکھ بُوا کی اَنا کو ٹھیس لگی۔ آنکھیں نکال کر بھائی کو گھورا، احتجاجی تیوروں کے نتیجوں سے باخبر، چھوٹے بھائی نے بڑی شائستگی سے بہن کو مخاطب کیا۔

''جی جی سا، آپ کی بھاؤناؤں کا میں آدر کرتا ہوں۔ روپی آپ کا خون ہے۔۔ پھر لاڈلی بھی۔۔ واستو میں اس کی یہ دَشا دیکھ کر، آپ کی پرتی کریا سُو بھاوِک ہے۔ مجھ سے بھی دیکھا نہیں جا رہا۔۔ پر ہم لڑکی والے ہیں، اپنی پگڑی دی ہے ان کے چرنوں میں۔ کیوَل ڈیڑھ ماہ کی تو بات ہے۔ ہم روپی کو آ کر لے جائیں گے۔ سماج کے بندھنوں کی رکشا کرنا ہمارا دھرم ہے۔ کرتویہ ہے۔۔۔'' یہ

کہتے کہتے سدرشن سنگھ کا گلا رُندھ گیا۔۔لیکن انہوں نے اُسے ضبط کیا اور بڑی اُمید سے بہن کی طرف دیکھا۔ بھائی کی فریاد بہن کے دل تک پہنچی۔لیکن دل نے پھر سرگوشی کی کہ نہ جانے یہ میری روپی کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں گے؟ انہوں نے گھبرا کر کونے میں دُبکی روپی کو دیکھا اندر جا کر اُس کے سر پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھا۔ایک خلش دل میں لئے اُف۔اُف کرتی ہوئی ڈیوڑھی کے پاس بنی اُس منحوس کوٹھری سے باہر نکل آئیں۔

جب راہوں سے زندگی کا قافلہ گزر رہا تھا۔کاش ان تاریک فضاؤں سے کوئی اجالوں کی طرف لے چلے۔۔اے روشنی کے جزیروں ایسی ضیا بخشو کہ زمین سے آسمان کی سرحدوں تک کوئی دھند نہ ہو۔کسی کی آنکھ زخمی نہ ہو، کسی کا خواب نہ ٹوٹے، کسی کا سفینہ غرق نہ ہو۔۔سیلاب اپنی مریادا میں رہے، پرندوں کی چہچہاہٹ کوئی نہ روکے۔۔پھول کھلتے رہیں۔چمن مہکتے رہیں۔۔۔ بہار اتراتی رہے، ایک مکمل آسماں۔۔۔ایک مکمل زمیں۔۔۔کوئی ہمیں دے دو۔۔۔دے دو۔۔

راج کنور کو لگا جیسے روپی ان تمام بندھنوں کو توڑ کر ننگے پاؤں، ننگے سر، آنکھوں میں حسرت لئے، دُور کہیں روشنی کے جزیرہ کی تلاش میں بھاگی چلی جارہی ہے۔ دور افق کی جانب۔۔۔ناگہاں انہوں نے پھر پیچھے مُڑ کر دیکھا، لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔۔۔انہوں نے گہری گہری سانسیں لیں، اور بوجھل قدموں سے جیپ کی جانب بڑھ گئیں۔۔۔دھوتی کو وہ لوگ ساتھ لائے تھے، راج کنور نے ہنگامے کے دوران ہی، اُس سے چپکے سے سامان لانے کو کہہ دیا تھا۔

--

اب جانے کی آگیا چاہیں گے، کہا سُنا، جو بھی ہو، اُسے معاف کریں''۔ سُدرشن سنگھ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پنڈت شورویر سنگھ اور روپی کی ساس سے جواب تک پیشانی پر بل ڈالے کھڑی تھیں کہا تو شورویر سنگھ نے بیوی کی طرف چند لمحے اُمید سے دیکھا کہ شاید یہ ناشتے وغیرہ کے لئے رسماً ہی سہی، روکیں، لیکن وہ تو ٹس سے مَس نہیں ہوئیں۔تو ہار کر خود ہی آگے بڑھے۔۔اور

ان کے سامنے کچھ کہنا مناسب نہیں ہوگا''۔ سوچ کر بیوی کی طرف کڑواہٹ سے دیکھا، لیکن ایسے کہ کسی کو علم ہی نہیں ہوا۔۔ اور باہر تک سدرشن سنگھ اور راج کنور کو چھوڑنے آئے۔۔ بس اتنا چلے تھے کہ، بات کریں تو بیوی کو سنائی نہ دے، کہ انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر، بھروسہ دلانے والے انداز میں، اپنائیت سے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔۔۔

''رات کو تو آئے تھے۔ ایک دو دن رُکتے تو بہتر تھا۔ پر اب جا ہی رہے ہیں تو بہن۔۔ انہوں نے راج کنور کی طرف ہاتھ جوڑ کر کہا۔۔ روپی کی ساس کی طرف سے میں آپ سے شما مانگتا ہوں۔ وہ مزاج کی تیز ضرور ہے، پر دل کی اتنی بُری نہیں۔ دراصل وہ بیٹے کی موت کا غم برداشت نہیں کر پائی ہے۔ آپ نشچنت رہیں۔ اب سے ڈیڑھ ماہ بعد آپ بہو کو لے جائیں۔ اُسے یہاں کوئی دُکھ نہیں ہوگا''۔

''اس سے زیادہ اور کیا دُکھ ہوگا، جو اِن آنکھوں نے دیکھ لیا۔۔ بڑے آئے بیوی کی لیپا پوتی کرنے''۔ راج کنور نے دل ہی دل میں سوچا مگر خاموش رہیں۔ سمدھی کے آخری جملوں کو سن کر انہوں نے اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دی اور جب ان کی طرف دیکھا تو۔۔۔ انہیں غصے کے بجائے اُن پر ترس آ گیا۔

اکلوتے جوان بیٹے کی ارتھی کے بوجھ سے ڈھلکے کندھے، بیوی کی دل خراش حرکتوں سے جھکی کمر، اور بہو کی سِندور سے اُجڑی مانگ کو دیکھ کر، تِل تِل مرتا۔۔ ایک شفیق سُسر۔۔۔ بہت ہی مہذب اور سمجھدار شخص راج کنور کے آگے کھڑا تھا۔ راج کنور نے انہیں دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔۔۔ سدرشن نے گلے مل کر وداعی لی اور۔۔۔ اپنے اپنے تصورات کو سینے میں دفنائے سدرشن اور راج کنور گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ گاڑی پر کشن ہی تھا۔ سامان دھوتی نے لا کر پہلے ہی رکھ دیا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی، دُھنوا نکل کر شور ویر سنگھ اور اُن کے درمیان حائل ہو گیا۔۔۔ اب مٹی، دھنوئیں کے غبار کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔

(باب-۵)

کہاں ہے میری بٹو۔۔میری روپی۔۔آپ تو یہاں تک آگئیں بائی سا۔۔اُسے پیچھے کیوں چھوڑ آئیں۔ ساتھ لاتیں نا۔۔۔ارے دیور جی۔۔یُوں چپ کیوں ہیں۔۔۔آپ لوگ''۔۔اُمید وبیم کے جنگل میں پھنسی ممتا نے ڈھیروں سوال کر ڈالے۔ پھر کوئی جواب نہیں ملا تو، دروازہ کی طرف بھاگیں کہ شاید روپی پیچھے رہ گئی ہو۔۔شاید بٹو گاڑی سے اُتر رہی ہو۔۔شاید۔۔ہاں ایسا بھی تو ہوسکتا ہے۔ گاڑی میں ہی اُسے نیند آگئی ہو۔۔دیکھوں تو۔۔نہیں، وہ بس اب آتی ہی ہوگی۔۔ابھی آکر میرے گلے لگ جائے گی۔۔۔خوب روئے گی۔۔خوب رُلائے گی۔۔وہ بھینچ کر اُسے سینے سے لگالیں گی۔۔ممتا کی گرمی دیں گی۔۔کہ جس کی پناہ میں اُس معصوم کے دل سے، غم کے سارے بادل چھٹ جائیں گے۔اسے کتنا سکون ملے گا۔ وہ کتنی ہلکی ہوجائے گی۔۔ہائے میری بچی نے کیسا غم جھیلا ہے۔ آجا میری بچی۔۔کہاں ہے تُو۔۔بھدرا رانی بڑبڑاتی ہوئی پھاٹک تک آگئیں۔ کسی نے بھی نہیں روکا۔۔روکنا فضول بھی تھا۔ حقیقت کا انکشاف آنکھوں کے سامنے ہوجائے تو، جلدی صبر آجاتا ہے۔۔کشن نے اپنی مالکن کو پُر اُمید نظریں لئے روپی کو ڈھونڈتے ہوئے دیکھا تو، اُس سے رہا نہیں گیا، اُس نے وہاں سے گاڑی ہٹانا ہی بہتر سمجھا۔

''ارے کشن۔۔ابھی بٹو کو اُترنا ہے۔۔کہاں لے جا رہا ہے گاڑی۔۔روک۔۔روک۔۔اور ان کے قدم ڈیوڑھی میں آکر رُک گئے۔۔۔حقیقت کا انکشاف ہوگیا تھا۔ روپی کا کہیں اَتا پَتا نہیں تھا۔۔۔کیسی ممتا، کیسی گرمی۔۔کیسی پناہ۔۔۔کیسے بادل۔۔۔سب کچھ تشنہ، تشنہ۔۔صحرا صحرا۔۔بالکل اس علاقے کی مانند۔۔دھول ہی دھول۔۔دھول کے دھورے۔۔دھول کے غبار۔۔دھول کی زمین۔۔دھول کا آسمان۔۔۔ہر طرف کرکری۔۔ہر طرف خاک۔۔۔وہ اچانک

سوال کرتے کرتے خاموش ہوگئیں۔۔خالی آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔۔منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔پلٹیں تو نند کی طرف دیکھا۔۔۔دیوار کی طرف دیکھا۔۔۔زبان بند تھی، مگر آنکھیں بول رہی تھیں۔۔ان کا پورا وجود ایک ایسا سوال بن کر کھڑا تھا جس کا جواب وہاں موجود ساس، سسر، شوہر، دیور، دیورانی، نند۔۔۔کسی کے پس بھی تو نہیں تھا۔

اس بیچ راج کنور کو ہوش آیا کہ کہیں بھاوج ذہنی توازن نہ کھو بیٹھیں۔۔۔! انہوں نے سبھد رارانی کے کندھوں کو۔دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔۔

''بھابی سا، پوچھو گی نہیں کہ اپنی روپ کنور کیسی ہے، کیوں نہیں آئی۔۔کچھ تو بولو۔۔کچھ تو پوچھو۔۔ یہ کہتے کہتے وہ بھاوج کو صحن میں بچھے تخت تک لے آئیں۔۔وہاں انہیں بھی بٹھایا خود بھی بیٹھیں۔۔دیورانی پانی لے آئی تھی۔راج کنور نے گلاس ان کے منہ سے لگادیا۔۔انہوں نے ایک گھونٹ لی اور ان کا چہرہ خاموش جھیل کی مانند نظر آنے لگا۔۔کیفیت بالکل بدل گئی۔۔وہ شاید نارمل ہو چکی تھیں۔۔۔ان کی آواز اُبھری۔

''کیا بولوں اور کیا پوچھوں نژند بائی سا۔۔سب کچھ تو معلوم ہے۔۔سوالوں کے جواب، خود سوال بن کر ہمارا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔۔قربانی کی زبان نہیں ہوا کرتی نژند سا۔۔۔بڑے طنطنے سے بھتیجی کو لینے گئیں تھیں۔۔نہیں بھیجا نا۔۔۔میں جانتی ہوں۔۔۔میری بٹو جب یہاں آئے گی تو ماتا بھی اُسے مشکل سے پہچان پائے گی''۔یہ کہہ سبھد رارانی نے ساڑی کا پلو، منہ میں ٹھونسا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی باورچی خانہ کی طرف چلی گئیں۔دوسرے ہی پل باورچی خانہ سے چھناک چھناک کی متواتر آوازوں نے عبرت ناک سناٹے کو چیر کر خشک سیاہ کائی آلود در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتی تھیں۔معمہ بن کر رہ جانے والی نسائیت۔۔کہ جس کے سوالیہ وجود کے آگے تمام مفکر، تمام دانشور ہی کیا تمام خدائی چکرا جاتی ہے۔آخر اس عورت کو چاہئے کیا۔کیوں یہ بار بار معمہ بن کر، سب کو پریشان کرتی رہتی ہے۔۔کوئی ہے جو اسے

سلجھا سکے۔۔۔لیکن سُلجھنے سلجھانے کی نوبت تو جب آتی ہے نا جب اُلجھایا جائے۔۔کون اُلجھاتا ہے اسے۔۔۔ یہ نظام۔۔۔ یہ رواج۔۔۔ یہ روایتیں، یہ وراثتیں۔۔ کہاں ہیں وہ اصلاحی تحریکیں۔۔۔ کہاں ہیں وہ مساوات و اشتراکیت کے ڈھنڈورے، کہاں ہیں وہ سماجیات کے نمائندے۔۔ ہے کوئی جو آئے۔۔۔ اور اس آلودہ فضا سے اُسے باہر نکال سکے۔۔ کون نکالے۔۔؟ اس کا متضاد جنس۔۔؟۔۔وہ خود بھی تو حیران ہے۔۔ پریشان ہے۔۔ یہاں سب حیران ہیں۔۔۔ پریشان ہیں۔۔۔ چٹیل میدان میں کہیں کچھ نظر نہیں آتا۔۔سوائے ڈوبتے سورج کے اُداس منظر کے، اور طلوع ہوتے آفتاب کی تابناک شعاؤں کے۔۔۔ کہ جس میں دیکھنے کی جرأت کی جائے بھی تو ہر شے آگ کا گولا نظر آنے لگتی ہے۔۔۔ ہر طرف آگ۔۔۔ ہر طرف حِدّت۔۔ جھلستا صحرا۔۔۔ جھلستے لوگ۔۔۔ کہ جن کی شام بھی دھنواں دھنوں۔۔ صبح بھی اُداس اُداس۔۔ ہر نظارہ میں تضاد۔۔۔ ہر حقیقت میں فریب۔۔۔ کیا کریں، کیا نہ کریں۔۔۔ کہاں اور کِدھر جائیں۔۔۔ ہے کوئی سمت۔۔۔؟ ۔۔ ہے کوئی رہ گذر۔۔۔کوئی راہ۔۔۔؟؟؟

(باب۔۶)

اُفوہ، اب بھی نو دن اور باقی ہیں۔۔اماوسیہ میں''۔۔۔دادی نے انگلیوں پر حساب لگاتے ہوئے سہد رارانی کے ہاتھ سے کھانے کی تھالی لیتے ہوئے کہا۔پھر بہو کے ردِ عمل کا انتظار کئے بغیر بے قراری سے بولیں۔۔''رتن اور سدرشن سے کہہ دیا تھا کہ روپی کو لینے اب کی بار تم ہی جانا، ایک بھائی کو بھی بٹھالینا۔۔۔رہت تو نبھانی ہوگی نا۔۔راج کو بُلا لیتے تو آ کر بھتیجی کو دیکھ لیتی۔۔۔پر دیکھو نا کیسا غم کھایا ہے دل پر۔۔۔روپی اُس کی بھتیجی نہیں، بہو! بیٹی ہے بیٹی۔۔پتہ نہیں راج اب کیسی ہوگی۔۔دس بارہ دن ہو گئے۔۔کوئی چٹھی پتری بھی نہیں آئی''۔ساس کو اپنی طرف پوری طرح مخاطب ہوتے دیکھ سہد رارانی نے اپنی چپّی توڑنا ہی مناسب سمجھا۔

''نُوند جی کو ڈاکٹر نے آرام کرنے کو کہا ہے۔آپ کے بیٹے کے دوست شہر گئے تھے، انہوں نے یہ خبر دی ہے''۔

''ہاں''۔۔(ٹھنڈا سانس بھر کر) سنتے ہیں شہر والوں کی بیماری ہے۔۔بڑا جان لیوا روگ ہے۔گاؤں میں تو کسی کو دل کا دورہ پڑتے نہیں سُنا''۔منہ میں، دادی کے نوالا تھا، وہ کبھی دائیں گال میں لُڑھک آتا، کبھی بائیں میں۔۔ایسا لگ رہا تھا، سوکھی ڈلیاں نگل رہی ہوں۔۔انہوں نے گلاس سے دو گھونٹ لے کر اُسے نیچے اُتارا۔

''بائی سا۔روپی کا دُکھ سہن نہیں کر سکیں۔دیکھ کر جو آئی تھیں''۔سہد رارانی نے سر پر پلّو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں عجب رہت ہے۔کوئی میکے والا خیر خبر نہیں لے سکتا۔ایک ایک دن نکالنا بھاری پڑ رہا ہے۔نہ معلوم کیا بیتی ہوگی، بچی پر، اس ڈیڑھ ماہ میں''۔کہتے کہتے دادی کے ہاتھ کھانے کی تھالی میں سے

سمٹ گئے۔ایک طرف تھالی رکھ، اپنے پلّو سے آنسوؤں کو پوچھا۔۔تو سُھد رارانی نے بوڑھی مامتا کو سمجھایا۔۔تھوڑے دن کی تو اور بات ہے۔۔یوُں آپ دُکھی ہوں گی تو طبیعت بگڑ جائے گی۔۔دھیرج رکھئے۔۔ساسُو جی۔۔۔سُھد رانے اس کے ساتھ گویا اپنے آپ کو بھی سمجھایا۔
''تھالی اُٹھالو بہوُ۔۔کھالیا۔۔جوان پوتی رانڈ ہو جائے تو بھلا بوڑھی ہڈیوں کو سُوستھ رکھنے کا کیا اُدیشیہ؟

آخر وہ کالی رات آہی گئی، جس کا سبھی کو انتظار تھا۔۔روپی کو گھر آنے کا۔۔۔ساس کو رانڈ بہوُ سے نجات حاصل کرنے کا۔۔۔ماں کو اپنی بیٹی کے گلے لگانے کا۔۔۔باپ کو بیٹی سے ملاقات کا۔اور دادی کو۔۔۔رسم ورواج کی پابندی کا۔۔۔کُل کی لاج کا۔۔۔!!
پنڈت رتن سنگھ، منجھلے بھائی سدرشن سنگھ کے ساتھ شام چھ بجے پرتاپپور کے لئے روانہ ہو گئے۔۔سُھد رارانی نے پُرامید ہو کر شوہر کو وداعی دی۔دادی نے دھوتی سے کہا۔
''اری جا، جاکر پانی کی بوتل بھرلا۔۔۔وہ ٹھنڈی والی بوتل لانا۔روپی تُو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے چل جا کے کام نبٹا۔۔مُوئی جب دیکھو ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی ہے۔۔سُھد را بہوُ۔۔کچھ کھانے پینے کا بھی رکھ ہے کہ نہیں''۔سُھد رانے ساس کی طرف دیکھا، اُن کی بات سُنی اور کچھ یاد کرتے ہوئے جاتی ہوئی روپی سے اونچی آواز میں کہا۔''روپی، رسوئی میں لال تھیلا رکھا ہے۔ذرا لے آ۔۔اور جیب میں رکھ دے''۔۔۔اور شوہر کی جانب مُڑ کر تاکید والے انداز میں کہا۔''دیکھو جی، راستے میں ہی کچھ کھاپی لینا، بیٹی کے گھر کا پانی بھی نہ پینا۔۔اور اُلٹے پاؤں میری بٹّو کو لے آنا۔آنکھیں پتھرا گئیں''۔۔کہتے کہتے سُھد را کو اچانک اس زور کے چکّر آئے کہ وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والی تھیں کہ پاس کھڑی دیورانی نے انہیں سہارا دیا۔رتن سنگھ نے بیوی کی اس حالت کو دیکھ کر ممتا کی شدّت کا اندازہ بخوبی لگالیا تھا ان کے اندر بھی کہیں کچھ بکھر سا رہا تھا۔اُن کا دل چاہا بڑھ کر بیوی کو سینے سے لگا، مضبوط بانہوں کی گرفت سے اپنی ذمہ داری، اپنی وفا کا بھروسہ دلاتے

ہوئے، اولاد کے غم کی شدّت کو بھی سمیٹ لیں۔ اور کہیں کہ۔۔ ''میری اردھانگنی، اتنا ویاکل نہ ہو۔۔ یہ غم ہم دونوں کا ہے۔۔ بلکہ میں ہوُں نا۔۔ تم فکر کیوں کرتی ہو۔۔ بس یہ گیا اور یہ آیا۔۔ اپنی روپ کنور کو لے کر۔۔۔''۔

لیکن نہ تو یہ موقع تھا اور نہ ہی انہوں نے اب تک کبھی اس طرح کی محبت و ہمدردی کا اظہار اپنی شریکِ حیات سے کبھی کیا تھا۔۔ اب اس کی کیا وجہ تھی۔۔ نہیں معلوم شاید روایتی خاندانی رعب و دبدبہ، کہ جہاں مرد کی اَنا، محبت کے اظہار کو اپنے شکنجے میں جکڑے رکھتی ہے۔۔ کہ جہاں نرم و شیریں جذبات کا اظہار مردانگی کو ضرب پہنچاتا ہے۔۔ یا اور کچھ۔۔۔ بہر حال ان کے اندرون میں اس وقت اتنا کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا کہ وہ ایک لمحہ بھی وہاں نہیں رُکے اور فوراً باہر نکل گئے۔۔ پیچھے پیچھے سُدرشن بھی گئے۔

جیپ بستی سے نکل کر ریگستانی ریت کی تہوں کو چیرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ دُور آسمان سے اُترتا سورج ان تہوں میں دھنستا جارہا تھا۔ شفق کی سُرخی نیلے اُمبر پر پھیلی ہوئی تھی اور سنہری بالو ریت کو سونے کی طرح چمکا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا، قدرت نے چاروں طرف ہلدی بکھیر دی ہو۔۔ تھکے ہارے اوُنٹ اپنے اپنے گھروں کی جانب جُگالی کرتے، چلے جارہے تھے۔ بڑے نکلی تھنوں میں پاؤ دودھ لئے، پچکی گائیں، سڑک کے ایک طرف بڑے سلیقے، فرمانبرداری اور خاموشی سے اس طرح چل رہی تھیں گویا انہیں ٹریفک کے اصولوں کا پورا پورا علم ہوُ۔۔ کبھی کبھی کوئی بچھڑی شرارت کر دیتی۔۔۔ یا کوئی بچھڑا چلتے چلتے ماں کے تھنوں تک منہ لے جانے کی کوشش کرتا تو۔۔ ماں جھنجھلا کر لات مار دیتی۔۔ ایسا لگتا کہ وہ کہہ رہی ہو۔۔ ''کیا ہے وقت بے وقت جب دیکھو، مُنہ مارنے چلا آتا ہے، نیت خوار''۔۔۔ جہاں بے راہ روی نظر آتی گوالے کی ہانک انہیں پھر سے منظّم کر دیتی پنڈت رتن سنگھ کی نظر ان تھوں پر پڑی تو، بے اختیار انہیں اپنی بٹو کی شرارتیں یاد آنے لگیں۔ چہرے پر نرم نرم تاثرات نے ڈیرہ جما لیا۔ تصوّر نے بیٹی کی پیدائش سے لے کر، لڑکپن تک کا سفر طے کر لیا۔۔ لیکن دوسرے ہی پَل جب گوالے نے شرارت کرتی ایک بچھڑی کے سونٹہ

مارا تو، انہوں نے ایسے آنکھیں بند کر، بھینچیں جیسے۔۔۔ سامنے بٹو تلملا رہی ہے۔۔ بس پھر کیا تھا، انہیں سخت پچھتاوے کا احساس ہونے لگا۔۔ گردن لٹک گئی۔۔ اور پنڈولم کی طرح ادھر اُدھر ہونے لگی۔۔ منہ سے اوف۔۔۔ فوہ۔۔ اوہ، اوہ" کی آوازیں خود بخود نکلنے لگیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنس گئیں۔ پشت کی سیٹ پر بیٹھے بھائی اور بھتیجے نے چونکتا ہو، اُن کی یہ کیفیت دیکھی۔۔ لیکن چہرے کے تاثرات نہ دیکھنے کی وجہ سے وہ کوئی خاص اندازہ نہیں لگا سکے۔ صرف اس کے کہ "باپ ہیں، جوان بیوہ بیٹی کا سامنا کرنے کی قوت کہاں سے لائیں گے، شاید اسی اُدھیڑ بُن میں ہیں۔"

"ابھی تو چار ماہ پہلے شادی کی ہے۔ کتنا خرچہ ہوا تھا۔ ساری جمع پونجی ختم ہوگئی، چیتاؤں سے گھر ناسو بھاوِک ہے۔ پھر میں بھی تو کچھ خاص نہیں کر پاتا۔۔ چار چار بیٹوں کا باپ ہو گیا ہوں۔۔ جو گندر بھی زمینوں پر رہتا ہے۔۔ کچھ اونٹ ہیں۔۔ اُن کی سواری سے ہونے والی آمدنی بھی مندر آنے والے یاتریوں پر نربھر ہے۔۔ اب اتنے بڑے پریوار کو چلانا۔۔۔ سارا بوجھ دادا کے کندھوں پر ہی تو ہے۔۔ پھر شہر میں چھوٹا الگ ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔ اس کا خرچہ۔۔ گھر بھر کی ذمہ داری۔۔ قصبہ بھر کے دُکھڑے۔۔ اُف۔۔ آمدنی اٹھنی خرچا روپیا"۔ سدرشن سنگھ کے ذہن میں ریگستان اور اس کے تھپیڑوں سے ٹکر لیتا ان کا قصبہ، کاشت اور زرخیزی کی تھوڑی سی زمینیں۔۔ اُس پر محدود وسائل۔۔ ان کا خاندانی پیشہ۔۔ تنتر منتر، کریا کرم۔۔ جھاڑ پھونک۔۔ وید پُران کی پوتھییں۔۔ اور۔۔ دوسری طرف برق رفتار سے ترقی کرتی دنیا۔۔ کامیاب افراد کی شبیہہ۔۔ اور بہت کچھ۔۔ تفکرات کے اس غول نے ان کے اندرون کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ لیکن بے بسی و بے کسی، کہیں نہ کہیں، خود انسان کے پیدا کردہ حالات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے"۔ شاید یہی سوچ کر سدرشن نے اپنا سر کھجایا۔۔ بلاوجہ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔۔ سب بے معنی و بے رنگ نظر آیا۔۔ آخر جیپ کی رفتار پر توجہ مرکوز ہوئی تو احساس جا گا کہ کاش میری زندگی بھی۔۔۔ ہاتھ ملتے ہوئے جب انہیں اور پچھتاوا [illegible] تو تمام اعضاء مضمحل کر، ستانے لگے۔

جیپ فاصلہ طے کرتی رہی۔ پاس بیٹھے اپنے مالک کی کیفیت کا اندازہ کشن کو ضرور ہو گیا تھا۔ اس نے جیپ کو سیدھی سڑک کے حوالے کر، رفتار میں اضافہ کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں جیپ سمدھیانے کے دروازہ پر تھی۔

''ہے رام! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔۔ کیا یہی میری بٹو ہے''۔ سر گھونسلا، پیلا چہرہ، خالی آنکھیں، سفید ہونٹ، مریل چال، جسم پر خون کے پرانے داغوں کے رنگ کا موٹا بھدا الباس، پاؤں میں انوٹھی۔۔ رتن سنگھ نے دیکھا ان کی سولہ سترہ سال کی الھڑ روپی۔۔۔ نے سولہ سترہ سال کی بڑھیا کا روپ دھر لیا ہے۔

باپ کے آنے کی خوشی میں روپی کوٹھری سے باہر نکل، چوکھٹ سے چند قدم باہر آ گئی تھی کہ اتنے میں اُسے گنجی پھونسی بڑھیا نے ٹوکا تو وہ وہیں رُک گئی۔ لیکن نظر بدستور باپ کے چہرے پر مرکوز تھی۔ دونوں باپ بیٹی کی عجیب کیفیت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے، لیکن یقین دونوں کو نہیں ہو رہا تھا۔

''افسوس یہ میں نے کیا کر ڈالا۔۔۔ کیسا انرتھ۔۔۔ روپی کی اس تباہی کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔''

''پاپا۔۔ مجھے لے چلو۔۔ بھگوان کے لئے جلدی چلو یہاں سے۔۔ باپو۔۔ اپنے گھر۔۔۔ ماں کے پاس۔۔ دادی کے پاس۔ چاچا، چاچی، بھائی، رمیا۔۔ سب کے پاس۔۔ اپنے گاؤں۔ اپنا تالاب۔۔ اپنی باوڑی، اپنے لوگ۔۔۔ لگتا تھا سوالات کا تقاضہ کرتا روپی کا ایک ایک عضو فریاد بن کر رتن سنگھ کے دل پر ہتھوڑے برسا رہا ہے۔

رتن سنگھ کا سر چکرانے لگا۔۔ انہوں نے روپی پر سے نظریں ہٹا لیں۔۔ اتنے میں روپی کے سُسر نے دونوں بھائیوں کا بڑھ کر خیر مقدم کیا۔ اندر، بیٹھک میں لے گئے۔ ہر طرح سے ہارے تھکے باپ کے قدم سمدھی کے ہمراہ تھے لیکن دل اور نظر بیٹی کے قدموں میں رگڑ رگڑا رہے تھے۔ یہی حال چچا کا تھا۔۔ وہ تو پہلے بھی آ کر گئے تھے۔ سب کچھ سمجھ رہے تھے، دیکھ رہے تھے لیکن روپی کی ایسا حالت ہو جائے گی، اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔ وہ کیا کہتے۔۔ خاموشی سے

بھائی کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔۔اور روپی کا چچازاد بھائی۔۔۔اُس کی تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسے رہتی رواج ہیں۔

روپی، تینوں کو اندر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔۔بڑی حسرت و امید سے کہ اتنے میں پھونسی بڑھیا نے، اُس کا بازو پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔

رتن سنگھ نے ہاتھ جوڑ، کمر خم کر، بڑی شائستگی اور نرمی سے بیٹی کو ہمراہ لے جانے کے لئے کہا۔

''تنِک وِشرام کر لیجئے۔۔جَل، چائے گرہنڑ کیجئے۔۔تب تک رات بھی گہرا جائے گی۔اندھیرے پگ کا بھی وہی سمے ہوتا ہے''۔۔روپی کے سُسَر نے مہمانوں کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔اتنے میں نوکر پانی لے آیا۔رتن سنگھ کا حال، مضطرب تھا،فوراً پگڑی اُتار کر، بھائی کو تھماتے ہوئے، دونوں ہاتھ جوڑ، سمدھی سے التجا بھرے انداز میں بولے۔

''میر باڑیں کرو، سگا جی۔۔رات اندھیری ہے اور یاترا کٹھن''۔۔انہوں نے کلائی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔۔''نو بج رہے ہیں۔۔اندھیرے پگ کا سمے ہو گیا ہے۔اَتی شِیگھر رسم کی ادائگی ہو جائے تو اُپکار ہوگا''۔

اتنے میں تھُل تھُل بدن لئے، بڑے ٹھسکے سے روپی کی ساس نمودار ہوئیں۔لمبا گھونگھٹ لے، پلّو کے کونے کو منہ میں اس طرح دبایا کہ آدھا چہرہ چھپا رہے، آدھا نظر آئے، ترچھی نظروں سے وار کرتے ہوئے بولیں۔

سَگا جی! اَیڑی پچھے کائی جلدی ہے۔گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کر لیتا۔تھے اَبے مہارے چوکھٹ تھوڑی پَدھارَولا۔پانڑیس وانڑیس تو پیو۔آنپڑیں بیٹی آنپڑے ہی لارے جاوے لی''۔

(اتنی جلدی بھی کیا ہے سمدھی جی، گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کر لیتے۔اب آپ ہماری چوکھٹ پر تھوڑی تشریف لاؤ گے۔آپ کی بیٹی آپ کے ساتھ جائے گی۔پانی وانی تو پیتے)

پنڈت رتن سنگھ روپی کی ساس کی عادت سے واقف تھے۔راج کنور نے انہیں ساری

بات بتائی تھی۔ ان معنی خیز نشتروں کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ مگر کڑوا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اُسی عاجزی وانکساری سے بولے۔

''پر نام سگی جی! وِشرام کی تو کوئی بات نہیں۔ پانڑیں جیب میں ہے۔ پھر ہم بیٹی والے ہیں۔ یہاں کا جل گرہنڑ کرنا نیَم نہیں۔ آپ آگیا دیں تو بہتر ہے''۔

پنڈت کے اتنے اصرار پر دونوں میاں بیوی کے منھ سے ایک ساتھ نکلا۔۔ ''جیسا آپ اُچت سمجھیں''۔ اور سب کوٹھری کی جانب بڑھ گئے۔۔ روپی کی خوشی کا تو ٹھکانہ نہ تھا۔۔ دل ہی دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ لیکن وہ اظہار کرنے سے قاصر تھی۔ کمبخت گنجی پھوسی بُڑھیا اپنی بے رونق آنکھوں کو مٹکا مٹکا کر روز تاکید کیا کرتی تھی۔

''دیکھ لچھاؤں اور اندریوں کو مارنا ہی وِدھوا کا دھرم ہووے ہے''۔ دھرم ہووے ہے''۔ رٹا رٹا کر روپی کا ستیاناس کر رکھا تھا۔ چنانچہ وہی تاکید اس گھڑی بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ روپی کیا کرتی، بس لمبا گھونگھٹ کئے، گٹھری بنی ایک کونے میں چٹائی پر سہمی بیٹھی تھی۔ سب کو آتا دیکھ تو وہ اور سکڑ گئی۔۔ جیسے وہ سب اُس کے اپنے نہ ہوں، کوئی غیر بھی نہیں۔۔ نہ جانے کون ہوں۔۔؟

رتن سنگھ سے تو دیکھا نہیں گیا۔ انہوں نے اپنی نظریں دوسری طرف کرلیں۔۔ اور پھر۔۔ سہمی ہوئی گٹھری کو، اُس بوسیدہ کوٹھری سے نجات مل گئی۔ جان لیوا سناٹا حویلی کی بلندیوں سے ٹکرا کر دھاڑنے کو بیتاب تھا۔

اندھیرے گھُپ میں ''اندھیرے پگ'' کی رسم ہوگئی۔ وہ رسم، جس کے لئے اتنی ہائے توبہ مچا رکھی تھی، کہ بیوہ جائے گی تو اندھیرے میں، اماوسیہ کی رات میں۔ ورنہ اُس کا منحوس سایہ کسی پر پڑ گیا تو۔۔۔! روپی جب سوار ہوئی تو، چڑیا کا بچہ بھی وہاں نہیں تھا، سوائے گھر والوں کے۔ کسی کو کیا پڑی تھی، جو ان کے معاملات میں دخل دیتا۔ وہ تھے ہی بڑے مغرور قسم کے لوگ۔۔ پھر عام آدمی تو حویلیوں کی طرف ویسے ہی نہیں پھٹکتا۔۔ پھر کیسا سایہ۔۔۔ کیسا شُبھ۔۔ کیسا اَشُبھ۔۔ سب باتیں تھیں۔۔ کھوکھلی اور بے بنیاد۔۔۔ عورت کے ذریعے عورت کو دِق لگانے کے

بہانے۔۔گھُن لگانے کی ترکیبیں۔۔"۔

روپ کنور کو جیپ کی پچھلی سیٹ پر جیسے ہی بٹھایا گیا، ساس کی نظر ڈرائیور پر پڑی۔ بَس بھنویں تن گئیں۔۔فوراً اعتراض کر بیٹھیں۔"

"بہو کو ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے نہ بٹھایئے۔۔آئینے میں نظر پڑے گی۔۔گاڑی سدرشن سنگھ جی چلاتے تو اچھا تھا"۔

دونوں بھائی جیسے تیسے وہاں سے نکلنا چاہتے تھے۔اسی اعتراض کو سُنا اَن سُنا کرتے ہوئے، اُسی طرف روپی کو بٹھایا، جدھر اُس کی ساس کی مرضی تھی۔

"بڑی آئیں، مجھ سے پردہ کرانے والی۔۔بٹو ہماری گود وں کھِلائی ہے، ہونہہ۔۔۔"

کِشن نے بُرا سا منھ بنایا اور گاڑی اس طرح اسٹارٹ کی کہ ڈھیر سارا دُھنواں چھوڑ، وہ آگے بڑھ گئی۔۔کِشن کو ایسی تسکین پہنچی گویا اُن لوگوں پر دُھنواں چھوڑ کر، اُس نے انہیں ٹکا سا جواب دے دیا ہو۔

--

(باب۔ ۷)

روپ کنور گھر آ گئی۔ ماتمی دھندلکے میں غرق، حویلی کے دروازہ میں کانپتی پنڈلیوں سے اُس نے قدم رکھا۔ ڈیوڑھی سے صحن میں آئی تو اُسے لگا۔۔ درودیوار، دوڑے دوڑے آئے اور اُس سے لپٹ گئے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں شفقت کی گھنیری چھاؤں میں اُس کا بچپن کھیلا کرتا تھا، وہاں اب تپتے صحرا میں خوفناک ذرّات کے مہیب ہیولے اپنے دائروں میں جکڑنے کو بے تاب نظر آرہے تھے۔ اور اس دلسوز ماتمی، خاموش۔۔۔ بے آواز نالہ وشیون نے کہ جو دل ہی دل میں اُنڈ گھمنڈ رہے تھے۔۔ ذرّوں سے تاروں تک کی ہر شئے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہاں سبھی آ گئے تھے۔

روپی صحن تک پہنچی تو فرطِ سراسیمگی سے وہیں زمین میں لُوھک گئی۔۔۔ ایڑیاں رگڑیں۔۔ اوڑھنی پھاڑی۔۔ اور چیخیں ماریں۔۔ حال سے بے حال ایک ہی رٹ لگائے جارہی تھی۔

''ماں او ماں۔۔ دادی او دادی۔۔ تم کیوں مجھ سے ملنے نہیں آئیں۔ کیوں مجھے اکیلا چھوڑا۔ تم تو مجھے اپنے جگر کا ٹکڑا کہا کرتی تھیں۔ کیا جگر کے ٹکڑے کو یوں سڑنے چھوڑ دیا جاتا ہے؟۔۔ بتاؤ۔۔ بتاؤ نا۔۔ اور یہ کہتے کہتے وہ بیہوش ہوگئی۔

دادی اور ماں کی سوگواری کا عجیب عالم تھا۔ دل پر پتّھر رکھ کر اس ناقابلِ برداشت وزن کو انہوں نے بڑی بہادری سے جھیلا۔ دونوں چُپ۔۔ دادی نے پوتی کو گلے لگایا تھا۔۔ ''نہ رو میری بچی نہ رو۔۔ بھاگیہ میں یہی لکھا تھا۔۔ پُچ پُچ۔۔ اور دادی اتنا کہہ ہانپنے لگیں تھیں۔ دل تھام کر وہ بھی وہیں لُوھک گئیں۔

''ارے سب منھ کیا تاک رہے ہو، پانی لاؤ''۔ اب دادا کی آواز اُبھری۔ جو یہ سب دیکھ کر بے حد

غمگینی کے عالم میں صحن میں بچھے تخت پر تھکے تھکے سے بیٹھے تھے۔

''ہے رام۔۔ یہ اس گھر پر کیسی بپدا آن پڑی۔ دیا کرو بھگوان''۔ بڑے تشویشناک لہجے میں انہوں نے بیوی اور پوتی کو دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ آسمان کی جانب اُٹھا دیئے۔۔ گھر کے تمام افراد روپی اور دادی کے اِرد گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ سب آبدیدیہ اور مغموم۔۔ اور دل ہی دل میں شرمندہ بھی۔۔ اتنے میں کوئی پانی لے آیا۔ دونوں کے منہ پر باری باری سے پانی کے چھینٹے دیئے گئے، ہوا کی گئی۔۔ آخر دادی بلی ڈُلیں تو انہیں سہارا دے کر اُن کی مسہری تک پہنچایا گیا۔ کچھ دیر میں روپی کو بھی ہوش آ گیا۔ سدرشن اُسے گود میں اُٹھا کر اوپر بھائی کے کمرہ میں لے گئے۔ مسہری پر لٹایا۔ سہدرا اور رتن سنگھ بھی پیچھے کے پیچھے گئے۔ کچھ دیر بعد، جب روپی کے دل کا غبار چھٹا تو اُسے اور سہدرا کو تسلی دے کر، رتن سنگھ مردانے کی جانب بڑھ گئے۔ سدرشن کو بھی اپنی بیوی سے دو گھڑی باتیں کرنا تھیں۔ اس لئے اپنے کمرہ میں چلے گئے۔

والدین کے کمرے میں روپی کو ایسا لگا جیسے اُس کا بچپن اُن کی گود میں اُتر آیا ہو۔۔ باپ چچا کے چلے جانے کے بعد روپی ماں سے لپٹ گئی۔ سہدرا نے اُس کا دھیان بٹانے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔۔ لڑکپن تو تھا ہی۔۔ جلد ہی روپی بہل گئی۔ اب اُسے اپنی حالت کا خیال آیا۔ ''مجھے نہا لینا چاہئے''۔ اور آنے والے وقت سے بے خبر روپی نے، ماں سے دھیرے سے نہانے کی بات کہی۔ سہدرا نے اُسے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

''بس چپ چاپ نہا لو۔۔ کسی کو معلوم نہ ہو''۔

سر اور بدن کیچڑ ہو رہا تھا۔ تیل نہ ڈلنے سے بال کنٹیلے جھاڑ کی مانند ہو رہے تھے۔ اس قدر کھجلی تھی کہ ایسا لگتا تھا، ڈھیروں جوئیں ہو گئی ہوں۔ روپی غسل کرتی رہی اور اُبکائی لیتی رہی۔ جب نہا دھو کر نکلی تو، سہدرا نے اُسی رنگ کے کپڑے دیئے، جو اُس نے ابھی ابھی اُتارے تھے۔

''ماں یہ کیا۔۔ میں یہ نہیں پہنوں گی''۔ اور ماں کے ہاتھ سے کپڑے لے کر زمین پر پھینک دیئے۔ سہدرا نے انہیں اُٹھاتے ہوئے پیار سے سمجھایا۔

''بنو، ایسا نہیں کہتے۔ اب تمہیں یہی رنگ اور یہی کپڑے پہننا ہوں گے۔۔ میری اچھی بچی۔۔ چپ چاپ پہن لو، ورنہ بات کا بتنگڑ بن جائے گا''۔ روپی نے کچھ سوچا۔۔ پھر واقعی میں خاموشی سے وہ لباس پہن لیا۔ شاید اُسے پھونسی بڑھیا کی تاکید یاد آ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ میکے آ کر، اس وقت مطمئن ضرور لگ رہی تھی۔ لیکن ماں کا دل۔۔ کچھ نہ پوچھو۔۔ کس قدر کٹے جا رہا تھا۔ آنے والے وقت اور حالات سے بے خبر میری روپی معصومیت کا پیکر بنی، بیوگی کے اس ویران جنگل کو اکیلے کیسے پار کرے گی''۔۔؟؟ فکر تھی کہ انہیں کھائے جا رہی تھی۔

''بنو میں تمہارے لئے کھانا لاتی ہوں۔ آج تمہاری پسند کی چیزیں بنائی ہیں''۔۔ یہ کہتے ہوئے وہ کمرہ سے باہر نکل گئیں۔۔ باورچی خانہ میں جا کر سمدرا نے چپکے چپکے تھالی تیار کی۔۔ خوب گھی تیل والے بیسن کے گٹے، سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی، گُڑ، کھیر وہ سبھی کچھ تو تھا، جو ان کی بنو کو پسند تھا۔ انہوں نے تھالی کو آنچل میں چھپایا اور کمرہ میں جانے کے لئے پلٹیں، تو سامنے دروازے پر دیورانی کو کھڑا دیکھ کر، شق رہ گئیں۔ اُس نے انہیں تھالی چھپاتے ہوئے دیکھ لیا تھا، جسے اب وہ سامنے لے آئیں تھیں۔۔ دیورانی بھی چِند رانے لگی۔۔''جی جی۔۔ پانی لینے آئی تھی، یہ تھالی کِس کے لئے لے جا رہی ہیں''۔

''ارے بہو، ذرا تھک گئی ہوں۔۔ کمرہ میں تھوڑا بہت جتنا کھا سکوں گی، کھا لوں گی۔ وہیں لے جا رہی تھی''۔

''کیا روپی نے کھا لیا''۔۔؟

''ہاں اُسے تو کِھلا دیا۔ بھلا یہ بھوجن اُس کے بھاگیہ میں اب کہاں''۔ انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

''کیا کریں جی جی دستور ہے۔'' اُسے یقین ہو گیا تھا کہ کھانا سمدرا اپنے لئے ہی لے جا رہی ہے۔ چنانچہ شک وشبہ کے وہ اثرات، جو باورچی خانے میں داخل ہوتے وقت اُس کے چہرے پر نمودار ہو گئے تھے، غائب ہو گئے۔ اور وہ جگ میں لُٹیا سے پانی بھرنے لگی۔۔ ٹُل۔۔ٹُل۔۔ٹُل۔۔۔ٹُل۔۔۔!

لمبے لمبے ڈگ بھرتی، ایک ایک چھلانگ میں دو دو سیڑھیاں طے کرتی، تھالی کو احتیاط سے سنبھالتی، سبھدرا نے اپنے کمرہ میں آ جھٹ سے اندر سے کُنڈی لگالی۔ اور تھالی کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے، روپی سے، پھوُلے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔

''لے روپی، جلدی سے کھانا کھالے۔ کوئی آ نہ جائے''۔

''بھلا جلدی کیوں، بھلا کون آ جائے۔ آ جائے تو آ جائے، گھر ہے''۔ روپی ماں کے اس رویّے کو قطعی نہیں سمجھ پائی، لیکن اُس وقت تو اسے، سامنے تھالی نظر آ رہی تھی، اسی کے ساتھ منھ میں پانی بھی آ گیا تھا، فوراً تھالی ہاتھ میں لی، اور کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ وہ کھا رہی تھی، اور ماں اُسے نہار رہی تھی۔ ''کھالے بیٹی، جی بھر کے کھالے، نہ جانے پھر تجھے ایسا کھانا کبھی۔۔۔ آگے کے خیال نے انہیں دہلا دیا۔۔ اور بن آواز کے ان کی آنکھوں سے گنگا جمنی جاری ہو گئے۔

روپی نے چند لقمے کھانے کے بعد ماں کو خاموش آنسو بہاتے دیکھا تو کہہ اُٹھی۔۔

''ماں اب کیوں روتی ہو۔ اب تو میں اپنے گھر آ گئی۔ کہیں اب مجھے واپس تو نہیں بھیجو گی، جو یوں روئے جا رہی ہو۔'' روپی کا نوالہ منھ کے پاس ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ اور وہ اپنے سوال کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔۔ ایک لمحے کے لئے اُسے اندھیرے سایوں نے گھیر لیا۔

''نہیں میری بچّی نہیں۔ اب تو کہیں نہیں جائے گی۔ یہیں ہمارے پاس رہے گی۔ ہماری نظروں کے سامنے''۔ انہوں نے روپی کے سَر پر ہاتھ پھیرا۔۔ اور اطمینان سے کھانا کھالو بٹو کہتے ہوئے رُکے نوالے کو اپنا ہاتھ لگا کر منھ تک پہنچایا اور روپ کنور کے اور قریب کھِسک آئیں۔

برسوں سے بند کمرہ روپی کے لئے کھُلوا دیا گیا تھا۔ روُپی، دھوُپی دو دن سے اس کی صفائی میں لگی ہوئی تھیں۔ ایک بان کی کھاٹ، ایک دری ایک لحاف اور ایک چمنی۔ تکیے کے نام پر پڑانے کپڑوں کو تہہ کر کے، سرہانے دری کے نیچے رکھ دیا گیا تھا۔

روُپی نے دھوُپی سے کہا۔۔ ''بائی سا، اِس گھُسالی رے مائینے کی کر رے وے؟ ونڑیں رے تو اِن حال رے مائینے رہڑوں نی آوے۔۔ مھانے تو ہَوچ ہَوچ نے ہی جی اَموج ری ہوائے''۔

(بی بی جی۔ اس کوٹھری میں کیسے رہیں گی۔ ان کو تو اس حال میں رہنا ہی نہیں آتا۔ میرا تو یہ سوچ سوچ کر دل بیٹھا جا رہا ہے)۔ دھونی نے چھت کا جالا صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ڈیڑھ مہینے میں سینگ ریڑوں آئی گیو۔ دیکھ جے، جد آئی تو، آپاں پہنچانڑ ہی نی پاواں لا''۔ بھگوان اودونڑ کی نی عورت نے نی دِکھاوے۔ یوں رَوج رَوج مرڑوں سوتو، ایک بار ستی ہو نو چوکھو''۔ (ڈیڑھ مہینے میں عادت پڑ جاتی ہے۔ دیکھنا جب آئیں گی تو پوری طرح بدلی ہوئی ہوں گی۔ اپَن پہچان ہی نہیں پائیں گے۔ بھگوان کسی عورت کو وِدھوا نہ کرے۔ یوں روز روز مرنے سے تو اچھا، وِدھوا، ستی ہو جائے تو ایک بار میں پاپ کٹے)۔

''ماں، میں آج تمہارے پاس ہی سوؤں گی۔ اپنے کمرے میں نہیں جاؤں گی''۔ روپی نے ٹھنکتے ہوئے ماں سے کہا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ آج رتن سنگھ زنان خانہ میں نہیں آئے۔ سب سو چکے تھے۔ صرف دادی کے کمرہ سے لالٹین کی تیز لو کی روشنی جھانک رہی تھی۔ ''یہ ابھی تک جاگ رہی ہیں، ٹوہ لے رہی ہوں گی''۔ سبھدرا نے اپنے کمرہ سے نکل کر، چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ''سب اپنے اپنے کمروں میں ہیں، فی الحال تو کوئی نہیں دیکھ رہا، سویرے جو ہوگا، دیکھا جائے گا''۔ والے انداز میں کنواڑ بند کر، بیٹی کے پاس بستر پر آکر بیٹھیں۔ آہستہ آہستہ بڑی نرمی سے، اُس کے سر میں انگلیاں پھرانے لگیں۔ ممتا کا لمس روپی کو آسمانوں کی اُڑان پر لے گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور چند لمحوں تک خاموش پڑی رہی۔ پھر لیٹے لیٹے ماں کا ہاتھ، اپنے ہاتھوں میں لے کر، آنکھیں بند کیئے کیئے بولتی رہی، بولتی رہی۔۔۔ ماں سنتی رہی۔۔۔ سنتی رہی۔۔

''ماں، کیا جیون کیول بیاہ تک سیمت ہے؟

''ماں، کیا اِستری اُپ بھوگ کی وَستو ماتر ہے؟

''ماں، کیا جیوَن کا کوئی اور اُدیشے نہیں؟

''ماں، ہماری پرمپرائیں بلیدان ہی کیوں مانگا کرتی ہیں۔ ہماری سوتنتر تا کو گر ہنڑ کیوں لگا دیا جاتا ہے؟

''ماں، سماج کی پرمپرائیں، اچھائیں دبانے کے لئے ہی کیوں بنائی جاتی ہیں؟

''ماں، کیا تم نے سوچا ہے، دبائی ہوئی اچھاؤں کے بُرے پریڑام، پوری منشّے جاتی کو بھگتنے پڑتے ہیں۔

''ماں، یہ سنسار میرا کیوں نہیں ہے؟۔۔ مجھے یہ سنسار دے دو ماں۔۔ مجھے سُلاؤ مت ماں! مجھے جگاؤ۔۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ماں۔۔ میں اس برہمانڈ کی دُھری ہوں۔۔ مجھے نئے سرے سے یہ سنسار رَچنا ہے۔۔ یہ سنسار میرا ہے ماں۔۔ سارا کا سارا میرا۔۔ سارا۔۔ سارا۔۔ سار۔۔آ۔۔آ۔۔آ''۔۔ روپی جواب کا انتظار کئے بغیر سوال پہ سوال کئے چلی جارہی تھی۔ اور سبھد رارانی کے پاس کسی بھی سوال کا کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ وہ تو بس بیٹی کے بالوں کو انگلیوں سے مسلسل سہلاتی چلی جارہی تھیں۔ کبھی دہش تیز ہو جاتی، کبھی ہلکی، کبھی دھیمی اور کبھی رُک جاتی۔ روپی بھی جانتی تھی۔ ماں کے پاس ایک سوال کا جواب نہیں ہے۔ وہ سوال جو درد بن کر اُبھرے، کرب بن کر اُبھرے، پھر جھنجھلاہٹ کی شکل اختیار کی، پھر اضطراب کی، غصّہ کی، اور پھر۔۔حق بن کر دم توڑ گئے۔۔ روپی سوال کرتی رہی، بڑبڑاتی رہی اور اسی کیفیت میں اس کی آنکھیں نیند کی خماری سے بند ہونے لگیں۔

ماں نے بس یہ کیا کہ بیٹی کے قریب لیٹ کر اُسے سینے سے لگایا اور خوابوں کی دنیا کی سیر کرانے لے گئیں۔

(باب۔۸)

کھٹ کھٹ کھٹ۔۔"آج کیا بات ہے۔۔جی جی تو سویرے پانچ بجے اُٹھ جاتی ہیں۔ دِن چڑھ آیا اور دروازہ ابھی تک بند ہے"۔خود کلامی کرتے ہوئے منجھلی بہو رینو کواڑ پیٹ پیٹ کر تھک گئی۔ مسلسل دستک سے سہدرا کی آنکھ کھل تو گئی تھی، مگر وہ دم سادھے بستر پر پڑی رہیں۔جیسے ہی دستک بند ہوئی، اُس کے دس منٹ بعد آہستہ سے اٹھیں۔۔بیٹی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔وہ بے خبر سو رہی تھی۔۔۔بے فکر و دلشاد۔۔نہ سسرال نہ میکا۔۔نہ کوئی ڈر نہ احساس۔۔۔ ایک معصوم سراپا۔۔انہوں نے اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی ہوئی دروازے تک آئی اور بِنا آہٹ کئے اُسے کھولا۔ چور نظروں سے باہر کا معائنہ کیا۔کوئی نہیں تھا۔ مطمئن ہو پلٹیں اور چپل پاؤں میں ڈال کر جیسے ہی دوبارہ باہر جانے کے لئے قدم بڑھائے تو چہرے کا رنگ ہلدی ہو گیا۔نہ جانے کہاں سے ساس آ ٹپکی تھیں۔

"بڑی بہو، روپی کہاں ہے؟"سہدرا کچھ جواب دیتیں، اس سے قبل دادی نے دروازہ سے اندر جھانکا اور طوفان کھڑا کر دیا۔

"تم ہوتی کون ہو، سماج کے نیَم قائدے توڑنے والی۔۔ماںتا ہم بھی رکھتے ہیں۔۔پَر یوں اَنرتھ نہیں کرتے۔۔ابھی رشتے دار آنے شروع ہو جائیں گے اور تم بیٹی کو بغل میں لئے پڑی ہو۔۔ تھوکیں گے وہ ہم پر۔۔بیوہ کے ساتھ اتنی دَیا ٹھیک نہیں۔۔"یہ کہہ، آؤ دیکھا نہ تاؤ، دادی نے اندر جا، پوتی کو جھنجھوڑ دیا۔وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا مائی!"اُسے لگا گنجی پھونسی بُڑھیا نے اُسے جگا دیا۔ پھر سامنے دادی کو دیکھا تو سنبھل کر بولی۔"دادی کیوں ناراض ہو رہی ہو"۔

''اُٹھ روپی۔۔چل یہاں سے اپنے ٹھکانے۔تیری ماں تو پاگل ہوئی ہے''۔روپی کا ہاتھ پکڑ کر وہ اٹھانے لگیں۔تو خود لڑکھڑا کر گر گئیں۔۔سھدرا رانی بھونچکی کھڑی تھیں۔دیورانی تو ساتھ تھی ہی، فوراً آگے بڑھ کر اُس نے ساس کو اُٹھایا۔''یہ آگ اس کی لگائی ہوئی ہے''۔سھدرا کو سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔۔نہ چاہتے ہوئے بھی، سھدرا نے ساس کو اٹھنے میں رینو کی مدد کی۔دونوں اُن کو کمرہ کی جانب لے جانے لگیں۔آئی، اوئی کرتی، کراہتی دادی کے غصّے میں رتّی بھر کمی نہ تھی۔انہوں نے تیور دکھاتے ہوئے، سھدرا کا ہاتھ اپنے شانے سے جھٹک دیا اور غیظ وغضب کی ایسی نگاہ ڈالی کہ سھدرا رانی نے روپی سے فوراً کہا۔

''بٹو چلو، تمہارے کمرہ میں چلتے ہیں۔۔سر پہ آنچل ڈال لو بیٹی''۔روپی کچھ نہ سمجھ پائی۔۔بس روبوٹ کی طرح جو کہا گیا، وہ کرنے لگی۔

''لیکن ماں میرا کمرہ اِدھر تھوڑی ہے۔کیا آپ بھول گئیں۔۔کہاں لے جا رہی ہیں''۔

''بٹو، وہ کمرہ تمہارے چھوٹے بھائی نے لے لیا ہے۔اب تم دوسرے کمرے میں رہوگی''۔روپی اب نیند کی خماری سے باہر آ گئی تھی، اور صورتِ حال کا کچھ اندازہ اُسے ہونے لگا تھا۔چُپ ہوگئی۔ایک لمحے کے لئے غیریت کا احساس جاگا۔لیکن ماں نے ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔اس لئے، اُس نے اُس احساس کو جھٹک دیا۔

کمرہ دیکھ کر روپی حیران رہ گئی۔آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔رُندھے گلے سے بڑی ہی معصومیت سے بس اتنا پکار سکی۔۔ماں۔۔۔ں!!!اور گٹھری بن، اپچھاؤں کو دبا، مَریَل چال سے دری بچھے پلنگ کی جانب بڑھنے لگی۔۔بالکل مُردہ آرزوؤں کے لوتھڑے کی مانند۔۔جیسے ہی اُس نے چوکھٹ میں قدم رکھا، اُسے محسوس ہوا کہ اندر سے، دونوں کواڑوں کی اوٹ سے نکل کر دو سائے اُس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

بوڑھی تائی، اُسے چمچماتی تھالی دکھا رہی ہیں۔اور گنجی پھونسی بُڑھیا ہاتھ بڑھا کر اندر گھسیٹ رہی ہے۔دونوں کے پوپلے منھ پھیلتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

سسرال اور میکے میں کوئی فرق نہیں تھا۔

اب گھر بھر کا سارا کام روپ کنور کو سنبھلا دیا گیا تھا۔ جھاڑو، پونچھا، برتن، کپڑے اور باوڑی سے پانی بھر کر لانا۔ دادی اور چچی کی نظریں بدستور اس پر رہتیں۔۔ اب یہ اور بات تھی کہ روپی سے کام ہوتا ہی نہیں تھا۔ لیکن وہ جی جان سے لگی رہتی تھی۔ روپی، دھوپی سے یہ سب نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے وہ اُن دونوں مالکنوں کی آنکھ بچا کر زیادہ سے زیادہ کام ترت پھرت ایسے نبٹا دیتی کہ کسی کو کانو کان خبر نہ ہوتی کہ کام کس نے کیا ہے۔ ایسے ہی ایک دن روپی چری لے کر باوڑی میں اُتر رہی تھی۔ تھکے تھکے، سنبھلے سنبھلے قدموں سے۔ دھوپی بھی پیچھے پیچھے تھی۔ اُس نے دیکھا کہ روپی سے خالی چری ہی نہیں سنبھل رہی ہے تو بھری ہوئی کیسے سنبھلے گی۔۔ بس فوراً آگے بڑھ کر روپی کے ہاتھ سے چری لی اور مؤدبانہ انداز میں بولی۔

''آپ تو اُٹھے اوبا ہو جاؤ۔ میں نیچے ہوں چروڑی بھرنے لاؤں۔ آپ سؤں ماہنے لے جائیجو۔ کسی نے بھی ٹھا منی پڑری''۔

(آپ تو یہاں کھڑی ہو جاؤ۔ میں نیچے سے چری بھر کر لاتی ہوں۔ آپ یہاں سے اندر لے جان۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا)

دھوپی نے روپی کے ہاتھ سے آہستہ سے خالی چری لی اور بنا روپی کے جواب کا انتظار کئے، باوڑی کی گہرائی میں اُترتے ہوئے خود بھی گہری سوچ میں مبتلا ہوگئی۔

''مرا وہ ہے اور بھگت یہ رہی ہے۔ کیسی ریت ہے، اِن بڑے لوگوں کی۔۔ نہ سسرال نہ میکا۔۔ وِدھوا کیا ہوئی رشتے ناطے ہی ختم ہو گئے۔۔ سب نے منہ پھیر لیا۔۔ ہونہہ''۔۔ دھوپی اپنی استعداد کے مطابق غور و فکر کئے جا رہی تھی اور چری کو پانی میں ڈبو ڈبو کر بھرتی جا رہی تھی۔ آخر اُس نے چری بھر کر، اوپر لا کر روپی کے سر پر رکھ دی۔ جیسے ہی روپی نے قدم بڑھاء، چھلک چھلک کر باورچی خانہ تک آتے آتے، آدھی رہ گئی۔۔۔ اور وہ پوری بھیگ گئی۔

روپی کو رہ رہ کر بوڑھی تائی یاد آ جاتیں۔۔۔ اور پھر۔۔ وجے سنگھ کا شاداب چہرہ! لیکن،

اب تو وہ روتی بھی نہیں تھی۔ سخت پتھر کی ہوگئی تھی۔ پتھریلا چہرہ۔۔ پتھریلی آنکھیں اور پتھریلے جذبے۔۔ نہ اب دادی اسے لاڈ کرتیں نہ چچا چچی۔۔ نہ بھائی، نہ دادا۔۔ یہاں تک کہ اب تو وہ شفقتِ پدری سے بھی محروم ہوگئی تھی۔۔ بس۔۔ سب کے سب منہ زبانی دیا کر دیا کرتے مگر ہمدردی کوئی نہیں کرتا۔ صبح صبح اس کی شکل دیکھنے سے ہر کوئی کتراتا۔ خوشی کے موقعوں پر غیر تو غیر، گھر والے تک کنی کاٹ لیتے۔۔ اس سلوک کا اُسے پوری طرح احساس تھا۔۔ وہ خود بھی اب احتیاط برتنے لگی تھی۔ گٹھری بنی، سہمی سہمی خاموش، الگ تھلگ، اپنے کام میں لگی رہتی۔۔ اور کام بھی کتنا اور کیا۔ بس جیسے تیسے کرتی رہتی تھی۔۔ سب کچھ نبٹا کر جب وہ رات گئے اپنے بستر پر جاتی تو، کبھی وجے سنگھ آکر ستانے لگتے۔۔ وہ دیوانہ وار انہیں پکڑنے کی سعی کرتی مگر۔۔ وہ ستاتے ستاتے غائب ہو جاتے۔۔ اور یہ وحشت زدہ سی سرابوں کے جنگل سے نکلنے کی کوشش میں صبح کر دیتی۔

ماں کا بُرا حال تھا۔ وہ اکثر بیمار رہنے لگیں۔ انہیں شروع میں تو آئے دن بخار آجاتا۔ اب مسلسل رہنے لگا۔ کمزور ایسی ہوئیں کہ جیسے دِق کی مریض ہوں۔ علاج تو کیا ہوتا، شوہر کی دی ہوئی جڑی بوٹیوں کو کبھی کبھار نگل لیا کرتیں۔۔۔ ایسا لگتا تھا، جیسے جینے کی آس ہی ختم ہوگئی ہے۔ روپی بھی اب ماں سے کوئی سوال نہیں کیا کرتی تھی۔ کمرہ کی صفائی کرنے آتی تو چپ چاپ نیچی نظر سے جھاڑو لگانے لگتی۔ سہدرا رانی کا دل پھٹ جاتا۔ وہ اسے کلیجے سے لگانے کو بیتاب ہو جاتیں۔ کواڑ بند کر لگا بھی لیتیں۔۔ لیکن روپی کا جسم مضمحل ہی رہتا۔۔ بیٹی کے سرد عمل پر ان کی داخلیت ریزہ ریزہ ہو جاتی، مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ سوائے اس کے کہ جب پانی سر سے اوپر چڑھ گیا تو کسی طرح ایک خط نند کو لکھ کر دھوبی کے حوالے کیا کہ اسے کسی طرح چھپا کر لال ڈبے میں ڈال آ۔

روپی گھر بھر کی صفائی کرتی مگر وہ اُس کمرہ میں کبھی نہیں جاتی، جہاں وہ اپنا بچپن چھوڑ آئی تھی۔۔ اب اس پر چچازاد بھائیوں کا قبضہ تھا۔ لیکن جب بھی اُدھر سے گزرتی، پتھریلے جذبے،

شبنم بن کر ڈھلکنے لگتے۔۔اور وہ بھاگ کر، سیدھی اپنی کوٹھری میں آ کر پلنگ پر اوندھے منہ دھڑام سے گر جاتی۔۔دادی اکثر دیکھ لیتیں، تو فوراً ٹوکتیں۔۔

''بھاگتی کیوں ہے روپی! بھاگنے سے رکت کی گتی بڑھ جاتی ہے۔۔سانسیں اوپر نیچے ہونے لگتی ہیں۔ پھر اچھائیں جاگنے کا ڈر رہتا ہے۔۔یہ کیا الھڑ کنواریوں کی طرح بھاگا کرتی ہے۔۔دھیمے چلا کر بچی''۔۔دادی کہہ تو دیتیں لیکن پھر انہیں احساس ہوتا۔۔

''ہے کرنی ماتا۔۔یہ نوعمری میں کیسی بپدا آن پڑی۔۔۔بچی پر۔۔کرپا کرو ماتا۔اُس کی اچھاؤں کو مار دو'' اور وہ رو دیتیں۔

قصبہ میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ روپ کنور وِدھوا ہو گئی اور اندھیرا پگ کر، میکے آ گئی۔راجکمار نے بھی خبر سُنی۔اُسے تکلیف پہنچی یا خوشی ہوئی، کوئی نہیں جانتا۔کیونکہ اُس نے کسی طرح کے جذبات کا کوئی اظہار کیا ہی نہیں تھا۔وہ بھی بیوہ کا حشر جانتا تھا۔خاص طور سے حویلیوں کی بیواؤں کے استحصال کے اُس نے بہت سے دبے چھپے قصے سُن رکھے تھے۔اُس نے ایک بار اپنے دوست بھیلو سے کہا بھی تھا کہ۔

''اگر اب کہیں روپی مجھے اکیلی دِکھ جائے تو، قسم کرنی ماتا کی۔۔ضرور بھگا لے جاؤں۔۔اور اُسے پھر سے سہاگن بنا دوں''۔

''ڈھائی آکھر تو پھوٹے نہیں۔شیخی مارنے چلا ہے۔تجھے بگ بگ کے سوا کچھ آتا بھی ہے، ہونہہ''۔تھوتھا چنا باجے گھنا۔۔بھیلو کا مقصد پوری طرح اُسے نامرد قرار دینے کا تھا۔اس لئے اُس نے اُس پر ایسا فقرہ کس دیا اور پچر کر کے بھینچے دانتوں کے درمیان سے پتلے تھوک کی پچکاری زمین پر دے ماری۔راجو اُس کے فقرہ میں پوشیدہ مطالب کو بخوبی سمجھ گیا تھا۔اسے بھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا۔اُس نے اچانک بھیلو کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے گریبان تک پہنچائے اور گلا پھاڑ کر چلّایا۔۔

''ہاں بھیلو، تو سہی کہہ رہا ہے۔پھاڑ دے گریباں۔۔۔پٹکی دے دے مجھے۔۔سینے پر چڑھ

جا میرے۔۔مار جتنا مار سکے"۔۔۔وہ اور کچھ کہتا لیکن بھیلو نے اس کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔۔

"یوں مارا ماری کرنے سے کچھ نہیں ہوگا راجو۔۔اپنی چیتنا کو جگا۔۔اپنے اندر جان پیدا کر۔۔۔ پریم کرتا ہے اُس سے تو سِدھ کر کے دکھا۔۔خالی خولی باتیں نہ کر۔"

"بھیلو تو کیوں میری چیتنا جگانے میں لگا ہے۔میری چیتنا سوئی رہے۔اُس کی اچھائیں مری رہیں۔۔یہی اُچت ہے۔۔چیر ڈالیں گے یہ لوگ۔۔نہیں کرنی مجھے اُس کی اور دُرگت۔۔ٹائم آنے دے، پھر دیکھنا"۔

"کیا ٹائم، ٹائم کی بات کیا کرتا ہے۔۔سال۔۔لا۔" اُس نے اُسے گالی دی اور بڑبڑاتا ہوا مندر کے اندر چلا گیا۔

راج کنور کو آج ہی بھاوج کا خط ملا۔پڑھا تو پڑھتی ہی چلی گئیں۔۔چچ۔۔چچ۔۔ چچ۔۔کیسی دُرگتی ہو رہی ہے معصوم بچی کی" وہ سخت تشویش میں گرفتار ہوگئیں۔ بلڈ پریشر ہائی ہوگیا۔ ویش نوک جانے کی رٹ لگانے لگیں۔۔ڈاکٹروں کو بلایا گیا۔انہوں نے آرام کی صلاح دی۔۔نہیں مانیں اور آرام حرام کرلیا اور کر دیا۔آخر شوہر نے سمجھایا کہ "جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی تو جلدی جا پاؤ گی"۔ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔مرض ٹھیک ہونے میں مریض کی خواہشات کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔جلد صحت یاب ہونے کی آرزو نے انہیں ایک ہفتہ میں تروتازہ کر دیا۔ میڈیکل معائنہ کے بعد ڈاکٹروں نے اجازت دے دی۔

انہوں نے اپنے پہنچنے کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔سب سے چڑھ ہو گئی تھی انہیں۔وہ راستے بھر روپی کے متعلق ہی سوچتی رہیں۔انہوں نے دل ہی دل میں عہد کر لیا تھا کہ۔چاہے کچھ بھی ہو، میں اب کی بار اُسے اپنے ساتھ لے آؤں گی"۔نکال لاؤں گی اُسے اُس ماحول سے، جہاں انسان نہیں بلکہ رواجوں اور وراثتوں کے دوش پر زندگی کی داستان تعمیر ہوتی ہے۔جہاں نہ عورت کا کوئی وجود ہے نہ مرد کا۔۔فرد کی شناخت ہی ہیں ہے۔انہیں اپنے قصبے سے، اپنی پنچایت

سے، پنچوں کے رویّوں سے، معتوب کے سرد عمل، شکست خوردہ ذہن اور اس کے نتیجے میں ان کی ناآسودہ زندگی کی لعنتوں کے کرب سے۔۔سب سے چڑھ ہوگئی تھی۔ایک ایک کر کے انہیں سب کا خیال آتا گیا اور ذہن میں استحصال کی ایک لمبی زنجیر تعمیر ہوتی چلی گئی۔ بلوغت سے ادھیڑ عمر تک کے سفر کے نشیب و فراز کو انہوں نے چند لمحوں میں اپنے تصورات کے پردے پر دیکھ لیا۔ان کی نسیں کھینچنے لگیں، چکر آنے لگے۔دل پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔اعضاء مضمحل ہونے لگے۔ان کی تیمارداری کے لئے ساتھ آئی نرس نے انہیں سنبھالا۔ضروری ادویات دے کر آنکھیں بند کر کے سو جانے کی صلاح دی۔راج کنور نے اس پر عمل کرنا ہی بہتر سمجھا۔صحیح سلامت پہنچ کر، واپس جو لوٹنا تھا۔

صبح کے ٹھیک سات بجے راج کنور کی کار دلیش نوک میں داخل ہوئی۔ڈرائیور نے گاڑی کا رُخ شمال کی طرف کر دیا۔ یہ راستہ ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے مندر تک جاتا تھا۔ ڈرائیور کو معلوم تھا کہ اُس کی مالکن جب بھی آتی ہیں، دیوی کے درشن پہلے کرتی ہیں، اس کے بعد حویلی جاتی ہیں۔لیکن آج راکنور نے، جو اَب تازہ دم لگ رہی تھیں۔ گاڑی سیدھے حویلی کی طرف لے جانے کو کہا۔

''حکم مالکن سا! پَر دَرشَن۔۔۔ن!''

''درشن حویلی میں ہی ہو جائیں گے۔دیوی کو وہیں پر گٹ ہونا پڑے گا''۔یہ کہتے ہوئے راج کنور نے نکٹی ناک کی طرح پہلے ایک نتھنے کو اوپر چڑھا کر نیچے کیا پھر دوسرے کے ساتھ بھی وہی عمل دہرایا۔۔۔اور پھر ناگواری و سوگواری کے تاثرات کی شدت سے ان کی پیشانی پر ایسی موجیں اُبھریں کہ وہ لعنت و ملامت کے نشیب و فراز میں ڈوبتی تیرتی رہیں۔

ڈرائیور نے سوچا۔۔''یہ بڑے لوگ کب بہکی بہکی باتیں کرنے لگیں، کوئی نہیں

جانتا''۔اُس کا دل تو چاہا، کندھے اُچکا کر کہے۔۔''مجھے کیا۔۔جیسی آپ کی مرضی''۔لیکن وہ صرف اسٹرنگ پر گرفت مضبوط کر کے رہ گیا۔اور کار نے حویلی کی طرف جانے والی سڑک پر رفتار پکڑ لی۔

(باب۔۹)

پھاٹک میں گاڑی کی گھوں گھوں کا شور، حویلی کے دَرودیوار میں سرایت کر خاموش ہوگیا۔ دادی کے کان کھڑے ہوئے۔۔ ''رونی۔۔ اری دھونی، دیکھ تو کون آیا ہے، کہاں مرجاتی ہیں، دونوں''۔۔ تجسس کے ساتھ وہ بڑبڑانے لگیں۔ سعد را اپنے کمرہ میں تھیں۔ بہت دھیمی آواز اُن کے کانوں میں گئی۔ آنکھیں تو پہلے ہی سے جانب در تھیں۔ اس لئے دل بلّیوں اچھلنے لگا کہ شاید ''بائی سا پد ھار گئی ہیں''۔۔ انہیں اس وقت بہت تیز بخار چڑھ رہا تھا۔ مسہری پر پڑے پڑے ہی کسمسانے لگیں۔۔ بہت مہین سی آواز نکلی۔۔۔ ''ارے کوئی ہے۔۔ یہاں آنا۔۔ ذرا دیکھنا۔۔ کس کی گاڑی کی آواز آ رہی ہے۔ کون آیا ہے۔ اونہہ۔ اونہہ، آنہہ، آنہہ۔۔ آہ۔۔ کوئی نہیں ہے۔۔ ان کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہونے لگیں۔

گاڑی سے اُترتے ہی راج کنور ڈیوڑھی میں بنی کوٹھری کی جانب بڑھ گئیں۔ اندر جھانکا۔۔ سیلن کا بھپکا نتھنوں کے پار پھڑ پھڑانے لگا۔۔ دل دھک سے رہ گیا۔۔ اُف۔۔ف۔۔ اپنے ہی گھر میں یہ دُرگتی''۔۔ انہوں نے آواز دی۔۔ ''روپی۔۔ روپی۔۔ بٹو۔۔ کہاں ہے میرے بٹیا''۔

دادی نے بیٹی کو دیکھا اور آواز بھی سُنی۔ خوشی اور حیرت کے ملے جُلے تاثرات سے اُن کی بوڑھی آنکھوں میں چمک آگئی۔ بیٹی کی علالت کا انہیں علم تھا۔ پر یوں اچانک صحت یاب ہوکر، اُس کا چپ چاپ چلے آنا۔۔ کسی چمتکار سے کم نہیں لگا انہیں۔۔۔ راج کنور اگرچہ سب سے پہلے روپی سے ملنا چاہتی تھیں، لیکن ماں کو سامنے دیکھ کر، اُن کی جانب بڑھیں۔۔ ''پرنام، ماں صاحب''۔۔ انہوں نے ماں کے پاؤں چھو کر آشیرواد لیا۔۔ ''جُگ جُگ جیو، سوبھاگیہ وتی رہو۔۔

راج۔۔ نہ کوئی سوُچنا نہ دوُ چنا۔۔ یوں اچانک چلی آئیں۔۔ سب کُشل منگل تو ہے''۔ خوشی و حیرت کے ساتھ اب شک وشبہ کا تاثر بھی شامل ہوگیا۔ ماں کی تشویش سے باخبر راج کنور نے انہیں اطمینان دلایا کہ، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔بس جی چاہا اور چلی آئی۔۔آپ کیسی ہیں؟'' انہوں نے اُچٹتی سی نظر ماں کے سراپے پر ڈالی اور نظریں پھر بھتیجی کو ڈھونڈنے لگیں۔

اتنے میں روپی دھوتی نے پوری حویلی میں خبر کردی کہ راج کنور صاحبہ پدھار گئیں ہیں۔ سبھدرا رانی نے سُنا تو بمشکل آنکھیں کھول کر اتنا کہا۔۔۔'' ذرا انہیں جلدی سے میرے پاس بھیج دو''۔

اور روپی۔۔اُسے تو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ گھر میں بنے مندر کی صفائی میں لگی ہوئی تھی۔ دھوتی اُس کی بڑی ہمدرد تھی۔ اُس نے سب سے پہلے یہ خبر روپی کو سنائی تو اُس کے ہاتھ سے جھاڑُو چھوٹ گئی۔ دل کی ڈلی حلق میں پھنستی ہوئی لگی اور سانسیں جیسے رُک گئیں۔ پاؤں کانپنے لگے۔ وہ وہیں زمین پر شِو پاروتی کی مورتی کے آگے بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ، آنکھیں بند کر ساکت ہوگئی۔ بس ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ بھینچ رہے تھے، ٹھڈی پر کچھ گھڑے بھی پڑ گئے۔۔ نہ جانے وہ اس وقت کیا مانگ رہی تھی۔ شاید بہت کچھ۔۔ یا شاید کچھ بھی نہیں۔۔۔! یہ کیفیت تو بس یونہی بھی ہوسکتی ہے۔ یہ آنسو تو بس بہہ کر نکل جانے کے لئے بھی ہوسکتے ہیں۔۔۔ یا پی کر ضبط کرنے کے لئے بھی۔۔ مول ہے کوئی ان آنسوؤں کا۔۔ان قطروں کا۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔ جب شبنم کے میٹھے قطروں کا ہی مول نہیں تو کھارے پانی کی کیا بساط۔۔۔ یہ تو یونہی بے موسم کی برسات ہے۔۔آتی ہے اور رُل ڈھل جاتی ہے۔

روپی کی اس خاموش فریاد نے شاید آج شِو پاروتی کو شرمندہ کردیا تھا۔ راج کنور کو دھوتی اپنے ہمراہ یہاں تک لے آئی تھی۔۔ وہ آئیں تو روپی کی اس طرف پیٹھ تھی۔ راج کنور نے کچھ سوچتے ہوئے بڑی آہستگی سے جوتے اُتارے، اور روپی کے رُوبرُو آکر کھڑی ہوگئیں۔ روپی جس حال میں تھی، ویسی ہی رہی۔۔ وہ اُس کے پاس دھیرے سے بیٹھیں۔۔۔ اور اُس کے

آنسوؤں کا مول چکانے لگیں۔۔۔انہوں نے روپی کے رُخساروں پر بہتے ہوئے موتیوں کو چُن لیا۔۔لمس پاکر روپی نے آنکھیں کھولیں اور بے تحاشہ اپنی پھوپی سے لپٹ گئی۔۔۔خاموشی نے سسکیوں اور پھر دہاڑوں کا روپ لے لیا۔۔باندھ ٹوٹ گیا تھا۔آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ اُمڈے آتا تھا۔راج کنور بھی خوب روئیں۔مندر میں سب آ گئے۔دادا، دادی، چچا، باپ، چچی اور روپی کا سہارا لئے سبھدرا رانی بھی۔۔ایسا لگا جیسے روپی کا سہاگ ابھی ابھی لُٹا ہو۔۔اس گھر کی کوئی بیٹی بیوہ ہوئی ہو۔۔اُس کے غم میں آج سب شریک ہیں۔۔روپی کو آج پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔۔اپنے گھر والوں کے درمیان۔۔۔ورنہ۔۔۔روپی کو اس کے آگے کے خیال نے پھر آنسو بہانے پر مجبور کر دیا۔

آخر جیسے تیسے غم کے بادل چھٹے۔۔۔محبت وشفقت کے بہتے دھاروں نے رواجوں اور وراثتوں کی گہری کھائیوں کو پاٹ دیا۔۔۔اب نہ دادی کی بے جا ٹوکا ٹوکی تھی، نہ چچی کی تیز نظریں۔۔نہ چچا کا ترس تھا نہ باپ کی مجبوری۔۔۔اور ماں۔۔۔اُس کی تو بیماری، جیسے غائب ہوگئی تھی۔انہیں اپنی نند پر پورا بھروسہ تھا۔بڑی امید تھی کہ اب بیٹی کا مستقبل تاریکی سے نکل کر تابناکی کی طرف مائل ہوسکتا ہے۔ان کے اس کامل یقین کو، شو پاروتی کی مسکراتی مورتی نے تقویت دی اور عقیدت سے ان کے ہاتھ مورتی کے آگے جُڑ گئے۔

رات کے کھانے کے بعد سب مل کر بیٹھے۔اور روپی کے مستقبل کے لئے غور وفکر کی گئی۔کئی تجاویز رکھی گئیں۔کچھ رد کر دی گئیں، کچھ پر کوئی متفق، کچھ پر کوئی۔۔آخر کار راج کنور نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ۔

''روپی کل سویرے میرے ساتھ شہر جارہی ہے۔بس چُپ چاپ ہم نکل جائیں گے۔وہاں اُس کی پڑھائی دوبارہ شروع کروادی جائے گی۔لوگ پوچھیں تو کہہ دینا۔۔'' کچھ ایسی بیماری لگ گئی تھی کہ علاج شہر میں ہوتا، اس لئے بُوا کے ہمراہ شہر بھیج دیا گیا''۔

دادا دادی نے تھوڑی ہچر مچر کی، لیکن راج کنور کے زور دینے پر مرے دل سے

رضامندی دے دی۔

دوسری صبح منھ اندھیرے ہی روپی اپنی پیاری پھوپی کے ساتھ سپنوں کے شہر کے لئے روانہ ہوگئی۔حویلی سے وداع لینے کے بعد راج کنور نے ڈرائیور کو گاڑی کرنی ماتا کے مندر لے چلنے کی ہدایت کی۔آج ڈرائیور نے محسوس کیا۔ان کے لہجے میں بڑی عقیدت تھی۔

تقریباً ایک کلومیٹر کی لہراتی پگڈنڈی عبور کر کے گاڑی مندر کے دروازہ پر جا کر رُکی۔ اندھیاری رات کے بطن سے البیلی صبح نمودار ہوئی تو،افق نے سنہری لباس پہنانے کی تیاری کرلی۔ گویا اس البیلی صبح کا استقبال کیا جارہا ہو۔۔فضا میں شگفتگی اور بالیدگی کا عنصر ایسے گھل مل گیا تھا جیسے گلوں میں مہک،ڈالوں میں لہک۔۔پرند میں چہک اور مگس میں شہد۔۔کہ جس کی مٹھاس، جس کا احساس دل ودماغ کو معطر کئے دے رہا تھا۔

''نرس تم یہاں بچوں کے پاس ہی رہو،میں درشن کر کے ابھی آتی ہوں''۔کیسریا اور دھانی رنگ کی سیفون کی لہریا ساڑی کے مہین پلو کو،راج کنور نے سر پر بڑی عقیدت سے اوڑھتے ہوئے نرس سے کہا اور خود ڈرائیور کے ساتھ،ادھر اُدھر چونکی نظروں سے دیکھتی ہوئی کہ کہیں کوئی روپی کو دیکھ نہ لے،پہچان نہ لے،مندر کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔۔وہ تیے جانے کدھر سے نکل آئے اور پہچانے پہچاننے والے انداز میں آنکھوں کو چندھیا کر دیکھا،پھر سونگھا اور دُم ہلانے لگے۔۔ راج نے مسکراتے ہوئے اپنے بیگ سے بسکٹ کا پیکٹ نکالا اور دو حصے کر۔مناسب فاصلے سے علیحدہ علیحدہ اُن کے آگے ڈال دیئے۔کتے بسکٹوں پر ٹوٹ پڑے۔۔دُم ہلتی جارہی تھی اور کُٹر کُٹر، چپڑ چپڑ کی آواز آرہی تھی کہ اتنے میں پنڈت جی کی آواز اُبھری۔

''راج کنور بائی سا پدھاری ہیں۔۔آج۔۔اتنے سویرے۔۔؟ وہ صبح کی آرتی کی تیاری کر رہے تھے،اُسی تھالی سے تلک لگا کر انہوں نے راج کنور کا استقبال کیا۔۔اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔۔جیسے ہی راج کنور نے مورتی والے حصے میں قدم رکھا۔کئی تعداد میں کالے سفید چوہوں سے اُن کا سامنا ہوا۔۔وہ اُن کے پاؤں کے اِردگرد اکٹھے ہوگئے۔۔کوئی پاؤں

پر چڑھ کر اِدھر سے اُدھر اُچک جاتا۔کوئی چونک کر دیکھتا، سونگھتا اور قریب آجاتا۔۔۔حالانکہ راج کنوران چوہوں کی یہ اُچھل کود بچپن سے دیکھتی آرہی تھیں۔لیکن پھر بھی انہوں نے اپنی ساڑی کو مع پیٹی کوٹ ٹخنوں تک اٹھایا اور ڈرائیور سے جلدی سے دودھ لانے کو کہا۔۔۔اس دوران وہ پنڈت جی سے گفتگو کرنے لگیں۔۔اتنے میں وہ بھاگ کر ایک لوٹے میں دودھ اور چار پانچ دونے لے آیا۔۔اُس نے مالکن کی مدد سے اُس میں دودھ انڈیلا اور رکھ دیا۔چوہے چُسر چُسر کر کے ناشتہ کرنے لگے۔راج کنور کو ان پر پیار بھی آیا اور ہنسی بھی۔۔لیکن عقیدت اپنی انتہا پر تھی۔۔انہوں نے دیوی کے سامنے جا کر ہاتھ جوڑے اور آنکھیں بند کر لیں۔۔بہت کچھ مانگا۔۔دُعا مانگ کر جب پلٹیں تو۔دان پیٹی میں ہزار ہزار کے پانچ نوٹ ڈال دیئے۔آگے بڑھیں تو اپاہج اور بے سہارا فقیروں، سادھوؤں کو ہاتھ پھیلائے دیکھا۔ جتنا ہاتھ میں آیا، دیتی گئیں۔آج وہ بہت خوش تھیں۔۔بیٹی جو مل گئی تھی۔ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل!

''دیو بھی کتنے خوش ہوں گے''۔انہوں نے دل ہی دل میں شوہر کو یاد کیا اور مسکرا اٹھیں۔۔ہوا کا شریر جھونکا آیا اور ایک لٹ کو انکے اُجلے رخساروں پر بکھیر گیا۔۔انہوں نے اُسے شرارت کرنے دی۔۔ ہاتھ ہی نہیں لگایا۔۔ بالکل دیوندر سنگھ کی طرح تھی اُس کی شرارت۔۔ وہ بھی جب ایسا کچھ کرتے۔۔تو وہ انہیں بالکل نہیں روکتیں تھیں۔۔۔''کتنا چاہتے ہیں، وہ مجھے۔میرے چہرے پر سدا مسکراہٹ بکھری رہے، اس کے لئے کتنے جتن کرتے ہیں۔۔اپنے بزنس میں مصروف ہونے کے باوجود۔۔''انہیں شوہر پر پیار آنے لگا۔

شوہر ہی نہیں۔۔دونوں بیٹے بھی تو ماں کی خواہشوں کو اپنی پلکوں پر سجاتے ہیں۔ابھی پچھلے دنوں انہوں نے بڑے بیٹے اشوک سے بہو لانے کا اصرار کیا تھا تو اُس نے وہ جواب دیا، جس کو سننے کے لئے ہر ماں کے کان ترستے ہیں۔

''ماں، آپ جس سے کہیں گی اُسی سے پھیرے لے لوں گا''۔وہ تو جھوم اٹھی تھیں۔۔اور یہی وجہ تھی کہ آج کل ہر تقریب میں، ہر کلب میں، پارٹی میں راج کنور کی نظریں لڑکیوں کا ہی تعاقب

کرتی رہتی تھیں۔۔۔کئی گھرانوں کی ماؤں نے، جن کی بیٹیاں شادی کے لائق تھیں، راج کنور کی چاپلوسی کرنا شروع کردی تھی۔۔ یہ سب چل ہی رہا تھا کہ انہیں دل کا دورہ پڑااور پھر حادثے پر حادثہ۔''کوئی بات نہیں، اب میں اور روپی، دونوں مل کر لڑکی ڈھونڈیں گے''۔ انہوں نے دل ہی دل میں سوچا اور پاس بیٹھی روپی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دھیرے دھیرے سہلانے لگیں۔

روپی تو جیسے آسمانوں میں اُڑ رہی تھی۔ اُس نے کار میں بیٹھتے ہی دیوی کرنی ماتا کو نمن کیا۔۔اور پھر کیا کچھ نہیں مانگا۔۔ مانگتی ہی چلی گئی تھی۔ میں اب یہ کروں گی، وہ کروں گی، یہ بنوں گی، وہ پڑھوں گی۔۔لوگوں کے درد دُور کروں گی، بالکل تمہاری طرح۔۔ بالکل بُوا کی طرح۔۔ اُس نے مندر کی جانب عقیدت سے دیکھا اور پھوپی کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔۔۔ مستقبل کو لے کر اُس نے رات سے اب تک اِتنے خواب اُدھیڑ بُن لئے تھے کہ اُسے بھی یاد نہیں رہا کہ اُس نے کیا کیا مانگا۔ شانے سے سَر اَب گود میں آ گیا تھا، پھوپی کے لمس سے شرابور، اُس نے آنکھیں بند کیں تو ایسے سوئی کہ جیسے برسوں کی جاگی ہوئی ہو۔

بڑے ارمانوں سے روپی کا داخلہ جانے مانے کوچنگ سینٹر میں کرادیا گیا۔ پھوپا، پھوپی دو چچیرے بھائیوں اور ایک چچازاد بھائی، جو میڈیکل کے آخری سال میں تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا، کے زیرِ سایہ روپی خود اعتمادی کی طرف بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔ نئے حوصلے، نئی امنگ، نئی ترنگ کے ساتھ بڑے ہی انہماک سے اس نے اپنی پڑھائی شروع کردی۔ جلد ہی سینٹر میں اس کی قابلیت اور محنت کے چرچے ہونے لگے۔ اُستاد اُس پر خاص توجہ دینے لگے، ٹھیک صبح دس بجے ڈرائیور گاڑی لگا دیتا اور روپی پھٹا پھٹ تیار ہوکر، اُس میں آ بیٹھتی۔ مقررہ وقت سے قبل ہی وہ سینٹر پہنچ جاتی۔ کلاس میں سب سے پہلے آنے والوں میں اس کا شمار ہوتا۔۔فرصت کے لمحوں میں ذرا سی گپ شپ نہیں، بلکہ سیدھی لائبریری کا رُخ کرتی۔۔ ہاں سنیچر کو وہ دوستوں کے لئے وقت نکال لیتی۔۔اس میں اس قدر تبدیلی آ گئی تھی کہ، ایسا لگتا تھا کوئی غم کا سایہ اس کی زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں۔۔۔اور یہ سب نتیجہ تھا۔۔ پھوپی کے پیار، پھوپا کی شفقت، صحت مند ماحول اور

راج کنور کی متوازن شخصیت کا۔ کہ ہمہ وقت وہ ایک دوست بھی تھیں۔۔ بیوی بھی، ماں بھی تھیں اور رہنما بھی۔۔

اُس کے دوستوں میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی۔ سب سے کھُل کر بات کرتی۔ اُس کی دبی صلاحیتیں اُبھر آئی تھیں۔ انہیں دوستوں میں پرمیلا بھی تھی۔ جس کے، وہ غیر شعوری طور پر بہت قریب آ گئی تھی۔ پتہ چلا کہ اُس کی بھی داستان روپی سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن اُس کے گھر والوں نے دنیا والوں کی پرواہ کئے بغیر اُسے شہر بھیج دیا۔ اور وہ یہاں کرائے کا کمرہ لے کر رہتی تھی۔ اپنی پڑھائی میں جی جان سے لگی تھی کہ ایک مرتبہ اس کے والد، جو ایک اسکول ماسٹر تھے۔ گاڑی کر کے اپنی فیملی کو لے کر، اُس سے ملنے شہر آ رہے تھے۔ اور حادثہ ہو گیا۔ بُری طرح ایکسیڈنٹ ہوا۔ اور کوئی نہیں بچا۔ بس پرمیلا اس دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ رشتے دار تو پہلے ہی سے خفا تھا، لیکن اُس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ معلوم کر کے ایک ودھوا آشرم میں رہنے آ گئی تھی۔ ٹیوشن کرتی اور جیسے تیسے اپنی پڑھائی جاری کئے ہوئے تھی۔ آشرم کا خرچہ کچھ نہیں تھا، کیونکہ ایک ٹرسٹ نے اُسے گود لے رکھا تھا۔ صرف لکھنے پڑھنے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے والی بیواؤں کو ہی وہاں رہنے کی اجازت تھی۔

روپی کو پرمیلا سے بہت تقویت ملتی تھی۔ اس کے حوصلے اور ہمت کی وہ قائل ہو چکی تھی۔ کبھی کبھار، وہ پرمیلا کے ساتھ اُس کے آشرم بھی چلی جایا کرتی تھی۔

اسی طرح دو تین دوست اور تھے، جن سے روپی کی اچھی گھنتی تھی۔ بس نئی فکر اور نئی پرواز کے ساتھ روپ کنور اپنے مقصد کے حصول میں لگ گئی تھی۔

اسی امنگ میں ایک شام اس نے اپنے بھائی پریم سنگھ سے کہا تھا۔

''پریم بھیا! آپ کا تو یہ آخری سال ہے۔ ڈگری لے کر دیش نوک میں کلینک کھول لینا۔ وہاں کے حالات تو آپ کو معلوم ہی ہیں''۔

''بالکل نہیں! روپی، مجھے شہر میں کلینک کھولنا ہوگا۔ میں نے پیسہ کمانے کے لئے ڈاکٹری پڑھی

''یہ وچار تو ٹھیک نہیں ہیں بھیا! روپی نے بھائی پر گہری نظر ڈالی تھی۔

''اب ٹھیک ہے یا نہیں! میں تو اتنا جانتا ہوں کہ گھر میں کمانے والوں کی کمی ہے۔ پیسے کی تنگی کا آئے دن سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میرے نزدیک پہلے گھر والوں کی سیوا ہے بعد میں۔۔''

''آپ کی بات میں بہت حد تک سچائی ہے۔ میں زیادہ زور بھی نہیں دوں گی''۔

اور دونوں بہن بھائی فکرمندی کے عالم میں دیر تک اپنے خاندان کی مالی حالت کے متعلق باتیں کرتے رہے تھے۔

راج کنور اتفاق سے ادھر سے گزری تو بھتیجا بھتیجی کو باتیں کرتے دیکھ کر وہ بھی شریک ہوگئیں۔۔ اس گفتگو سے انہیں روپی کی ذہنی نشو ونما اور غور وفکر کی بالغ نظری کا احساس ہوا۔۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئیں کہ ایک ننھے مرجھائے پودے کو باغباں چاہے تو تر وتازہ کر پروان چڑھا سکتا ہے اور چاہے تو وہیں مسل کر اس کے وجود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا سکتا ہے۔

(باب۔۱۰)

دیش نوک میں روپی کی قابلیت اور محنت مشقت کی خبریں برابر پہنچتی رہتی تھیں۔ کبھی راج کنور کے خط کے ذریعے اور کبھی پریم سنگھ کے ذریعے۔ وہ تعطیلات میں گھر جاتا تو، حویلی والوں کو تفصیل سے رروپی کے متعلق بتاتا۔ سمھدرارانی اور رتن سنگھ تو باغ باغ ہو جاتے۔۔۔ چچی پر کوئی ردِّعمل نہیں ہوتا۔۔۔ ہاں دادی سُن کر کچھ مضمحل سی ہو جاتیں اور اپنے پوتے سے تاکید کرتے ہوئے کہتیں۔۔ ''دیکھ بیٹا! روپی کی پڑھائی والی بات حویلی سے باہر نہ جانے پائے۔۔۔ بیماری کا بہانہ بنا کر اُسے بھیجا ہے، لوگوں کو معلوم ہو گیا تو ناک کٹ کے رہ جائے گی''۔۔ پھر وہ شک وشبہ میں ایسی گرفتار ہو جاتیں کہ اپنی مالا کو تیزی سے جپنے لگتیں، جب یوں بھی سکون نہ ملتا تو اُسے اٹھا کر ایسے پھینکنا چاہتیں کہ جیسے اُس کا دانا دانا بکھر کر ان کی نفسیات کے گہرے غاروں میں پوشیدہ شدتِ شوق کی تشنگی کے احساس کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔۔۔ ان کا لاشعور، انہیں جھنجھوڑتا۔۔

''کیا ودھوائیں بھی اتنا سُکھ بھوگ سکتی ہیں۔۔۔ کیا انہیں نیا سنسار جینے کا اُدھیکار دیا جا سکتا ہے؟ نہیں کداپی نہیں! ہمارے زمانے میں تو۔۔۔!!اور پھر وہ پلنگ پر دراز ہو، آنکھیں بند کر لیتیں۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتیں پھر ٹھنڈی پڑ جاتیں۔

مردانے کے دہرے دالان میں بچھے بڑے کھٹے پر پڑے دادا بشن سنگھ بھی یہی سب کچھ سوچتے۔۔ لیکن ان کے تو کچھ بزرگ دوست تھے، جو روز صبح کے وقت آ جایا کرتے، اُن کا اور اپنا دل بہلاتے اور چلے جاتے۔۔ اور پنڈت بشن سنگھ رواجوں اور جکڑ بندیوں کے حصار سے اپنے اندرون کو صاف بچا لے جانے میں کامیاب ہو جاتے۔۔

مردانے کے اس دالان میں جہاں پنڈت بشن سنگھ کا لمبا چوڑا کھاٹ براجمان تھا، کچھ پُرانی کرسیاں بھی اس کے اردگرد رکھ دی گئی تھیں۔۔ قصبے کے چند بزرگ، جنہیں اُن کا لنگوٹیا یا رہی کہا جا سکتا تھا۔۔۔ اپنے معمول کے مطابق آتے اور پھر اُن کی محفل جمتی۔ لیکن یہ لوگ بھول کر بھی زنان خانے کے متعلق کوئی بات، کوئی ذکر نہیں کیا کرتے تھے۔ یہی ان کی تہذیب تھی۔ آج بھی پنڈت جی کچھ افسردہ سے تھے کہ سُکھی رام حلوائی اور اللہ رکھا خاں اپنی جھکتی، کانپتی دیہہ کے ساتھ وہاں آن پہنچے۔

''رام رام پنڈت جی۔۔ رام رام سکھ رام۔۔۔ رام رام اللہ رکھا۔۔۔ براجو۔۔۔ پنڈت جی نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور سناؤ کیسا چل رہا ہے۔ سُنا ہے، کل مندر کے احاطے میں کسی سادھوی کا بھاشن تھا۔ رتن بتا رہا تھا، قصبہ میں اُسے لے کر بڑی چرچا ہے''۔

''بائی بھئی! گھنڑیں لوگ اُمڑیا۔ لوگ تو سادھو سنتاں رے کنے دھیان نے دھرم ری باتاں سُنڑ میں جاوے، پر آ تو، ایڑی تیج تر ار سادھوی ہے، جو دھرم، جاتی، راجنیتی جیری باتاں لیار ے یوں بول ری، اے جری آری باتیں تو لوگاں رے ماتھا اوپر جاری ہے۔ کچھ لوگ تو ایڑا ایا نگا مونڈا بنانے بیٹھا رے، جرے سُوئی چیلی بار سُنی ہو۔ نئی نئی لوگ تو گاڑیاں بھی دیکھی رہا ہے کہ ئی تھا کھو، آئی ہے پتہ را ل''۔۔ سُکھی رام نے انگوچھے سے اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

(ہاں بھئی! بڑی بھیڑ تھی۔ لوگ سادھو سنتو کے پاس دھرم کی باتیں سننے جاتے ہیں۔ پر اس سادھوی نے تو راجنیتی، جات پات اور دھرم کو ایسا توڑ مروڑ کر پروسا کہ لوگ بڑے اچرج اور دلچسپی سے سُن بھی رہے تھے اور زیادہ تر کی تو بدھی میں کچھ بیٹھ ہی نہیں رہا تھا، تو چپ چاپ بھی تھے۔ کوئی کوئی تو بُرا بھلا بھی کہہ رہا تھا کہ یہاں کہاں یہ چھنال آ گئی'')

''ہاں، میں بھی گیا تھا۔ میرے پلّے بھی کچھ خاص نہیں پڑا۔ مجھے لگتا ہے، یہ قصبہ کی ہوا خراب کرنے آئی تھی۔ پورے تام جھام کے ساتھ قافلے کا قافلہ تھا۔ اخبار والے، ٹی۔ وی والے سبھی تو تھے۔۔ ارے پنڈت تم یہ دیکھو کہ لوگوں کو پیسے دے دے کر، ساڑیں بانٹ بانٹ کر، شراب کی

بوتلوں کا لالچ دے دے کر مندر استھل پر لایا گیا تھا''۔۔اللہ رکھا نے سرگوشی کے عالم میں پنڈت بشن سنگھ کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

پنڈت جی نے دونوں کی باتیں دھیان سے سنیں۔ٹھنڈا سانس بھر کر بولے۔

''رتن سے کہوں گا، پنچوں اور جھمانوں سے مل کر اس کیچڑ کو پھیلنے سے روکیں۔ویسے اپنے اوپر دیوی کی کرپا رہی ہے۔کچھ نہیں ہوگا۔پرنتو ساودھان تو رہنا ہی ہوگا''۔

''ویسے تو اس قصبہ کی کسی کو سُدھ نہیں ہے نہ دوردرشن، نہ اخبار نہ سرکار کب سے دیکھ رہے ہیں۔ الکشن کے دنوں میں منہ کھول کھول کر وعدے کرتے ہیں۔۔۔جیت جاتے ہیں تو پھر صورت تک نہیں دکھاتے۔۔بے غیرتی کی بھی حد ہوتی ہے''۔اللہ رکھا نے لقمہ دیا۔

''ہاں اور کیا۔۔اب پنچ سرپنچوں کو ہی کچھ کرنا ہوگا۔ورنہ یہ دِشا۔۔کیا دَشا کرے گی۔۔۔ہم تو انو بھوی ہیں۔۔۔واتاورن دوشت ہونے سے روکنا ہوگا۔۔پر یہ کیا کس نے ہے؟ کس کا ہاتھ ہے، اس سب کے پیچھے۔؟ بشن سنگھ کے لہجے میں تشویش اور جھنجھلاہٹ کا پُٹ تھا، ساتھ ہی اپنی پیری کی مجبوری بھی جھلک رہی تھی۔

''وہی مانگڑیاجات کے پارٹی والوں نے''سکھی رام نے سرگوشی کرتے ہوئے راز کھولا۔

''ہاں، گانے بجانے بھجن کیرتن سے تو اب ان کا پیٹ بھرتا نہیں۔گزشتہ برس گئے تھے، کسی بڑے شہر، پروگرام دینے۔۔۔وہاں کسی سیاسی پارٹی کے لوگوں سے امام الدین نے اپنا کھونٹا باندھ لیا۔۔چھورا تیز تو ہے ہی۔۔۔لالچ میں آگیا۔۔نام بھی، کام بھی اور پیسہ بھی''۔۔اللہ رکھا نے اب بیڑی سلگالی تھی۔

''اے لوگ دھرم کو کٹھے کٹھے بیچ کھایا آنی پیڑھی نے کئی ٹھا ہوئی گیو ہے۔۔یانے تو بس پیا کماؤنڑی لاگیوڑی ہے۔اوندا سیدھا کوئی بھی طریکو ہو، یاں تو بس کماؤوڑوں ہے۔ایڑاں کئیں کوئی کرتو یہ کوڑ بس، سماج رے پرتی؟''سکھی رام نے اخلاقی سوال چھوڑا۔

(دین دھرم تو ان کا ہے ہی نہیں۔یہ نئی پیڑھی کو نہ جانے کیا ہوتا جارہا ہے۔اللے

سیدھے کیسے بھی ہو، بس دھن اکٹھا کرنے کی لگی رہتی ہے۔ سماج کے پرتی کیاان کا کوئی کرتویے نہیں")

"میں نے تو پنڈت۔۔ تم کو اُسی وقت ہوشیار کیا تھا کہ رفیق الدین کو اپنے کنبے کے ساتھ اس دھرتی پر پناہ نہ دو۔۔ تم نے میری سُنی نہ پنچوں کی۔۔ اب اُسی کے پوتے پر پوتوں کی پھیلائی وباسے بچو۔۔۔ ارے یہ لوگ نکالے ہوئے ہیں جیسلمیر سے۔۔ وہاں بھی، سُنا ہے، ان کے جمانوں نے انہیں دیس نکالا دے دیا تھا"۔

"کئی بات کئی ہوئی ہے؟ منے بھی تو ٹھاہ پڑے"۔ سکھی رام کے کان کھڑے ہوگئے۔ اُس نے بیڑی کا آخری کش لے کر ڈھیر سارا دھنواں چھوڑے ہوئے پوچھا۔

(کیابات تھی، ذرا مجھے بھی تو کوئی بتاؤ)

وہ اُن دونوں کے بالکل قریب آگیا۔ گویا اُن کی باتیں کوئی سُن نہ لے۔ گویا یہ ایسا راز ہے، جسے کوئی نہیں جانتا۔ جبکہ ایسا نہیں تھا۔ قصبہ کے زیادہ تر لوگ اس کنبے کے متعلق سب کچھ جانتے تھے۔ اتفاق تھا کہ سکھی رام کے کانوں تک بات نہیں پہنچی تھی۔

"ہاں اُس سمے میں نے یہ زرین غلط لے لیا تھا۔ پر رفیق تو ایسا نہیں تھا۔ بڑا آگیا کاری ہوا کرتا تھا۔ دیوی کے مندر کی پڑی کر ما کرتے سمے کیا بھجن گاتا تھا کہ من شردھا سے جھوم جھوم جاتا تھا۔۔ کتنے بھگت سر دُھنتے تھے۔ اُس سمے یہ امام الدین کوئی پانچ چھ سال کا تھا۔ چھورا! ڈھولکی کی تھاپ پر ٹھمک ٹھمک کر نرتیہ کرتا تھا۔ کبھی کبھی کمانچہ[1] (Kamayecha) بھی بجاتا تھا"۔

"پر دیکھوان کا کنبہ بڑھ کر آج کتنا ہو گیا۔ پوری گواڑی میں کوئی اسی پچاس گھر ہوں گے"۔ ان دونوں کی گفتگو سے سکھی رام کو اپنے سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ اُس نے پھر اصرار کیا کہ "مجھے ان لوگوں کے دیش نکالے کے بارے میں بتاؤ۔ تو پنڈت جی نے اس کے اشتیاق و تجسس کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے بتایا۔

1- kamaycha is played by Manganiar (Muslim) caste singer in jaisalmer and Barmer Region tha kamayacha is a chrodophonic instrument which is played with the bow

''ارے بھایا۔۔۔ پر بہت ہوگئی تھی۔رفیق کی چھوٹی بہن کو، اُس جمان کے بیٹے سے۔۔ایک تو راٹھوڑ راجپوت اور دوسرے رَن ویر سنگھ کا پُتر۔رن ویر بڑا رعب داب والا آدمی تھا۔ سنتے ہیں رفیق کی بہن بڑی روپسی تھی۔آنکھیں بڑی سُندر تھیں، اُسکی۔گاتی بھی اچھا تھی۔قد بھی تیر کمان جیسا تھا۔مندر کی پوجا کے سمے مانگڑیے بھجن گا رہے تھے۔بس وہیں آنکھیں چار ہوگئیں۔۔۔ مَر مِٹا دیوانہ۔دونوں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔۔تُو تو جانتا ہے اللہ رکھا کہ حویلیوں کی زنانیوں سے ان کی عورتوں کا رشتہ ہوتا ہے۔۔مالکن اور خدمت گار کا''۔بشن سنگھ نے اللہ رکھا سے تصدیق چاہی، اُس نے ہاں میں سر ہلایا۔۔۔یہ گاہے بگاہے حویلیوں میں آتی جاتی رہتی ہیں۔۔بس وہیں کہیں کسی کونے کُھدرے میں دبوچ لیتا تھا۔''

''پر یہ روز روز تو ہوتا نہ ہوگا۔پھر جدائی میں ملنے کی کیا صورت ہوتی ہوگی''۔سکھی رام اتنا کسمسایا، اتنا کسمسایا کہ کُرسی ٹیڑھی ہوگئی اور وہ گرتے گرتے بچا۔

''دیکھ اللہ رکھا۔۔بوڑھی ہڈیوں میں بھی ابھی اتنی حرارت باقی ہے کہ کرسیں توڑ رہا ہے''۔پنڈت جی نے سکھی رام کو چھیڑتے ہوئے اللہ رکھا کو آنکھ ماری۔۔۔دونوں بے تحاشا ہنس دیئے اور سکھی رام کچھ قائل سا ہوگیا۔لیکن اپنے یاروں سے ہار تھوڑی ماننا تھی۔ڈھیٹھ بن کر وہ بھی ہنسا۔۔''ہی ہی ہی۔۔۔صبح کی گرما گرم جلیبیوں کی حرارت ہے پنڈت۔کسی کو لاؤ تو، کونے کُھدرے میں کیا، سب کے سامنے دبوچ لوں''۔۔سکھی رام کچھ موڈ میں آگیا تھا، پنڈت نے محظوظ ہوتے ہوئے آگے بات جاری رکھی۔۔۔

''ہاں تو سکھی رام۔۔۔ مجھے رفیق نے ایک بار بتایا تھا کہ اُن کے یہاں اپنی پریمکا سے ملنے کی ایک انوکھی ترکیب ہوا کرتی تھی۔پر مجھے ڈر ہے، کہیں تم، اس عمر میں یہ ترکیب آمانے میں لگ گئے تو۔۔۔؟

''اونہہ، ہنسی ٹھٹھا نہ کرو۔۔اب اس عمر میں تو موتیابند والی ملے گی۔۔نہ وہ دیکھ سکے گی اور نہ انکھیاں چار ہوں گی''۔۔سکھی رام نے مصنوعی نخرہ دکھاتے ہوئے کہا اور تینوں زور سے ہاتھ پہ

ہاتھ مارتے ہوئے ہنس دیئے۔۔ تینوں کو پرانی باتیں دہرانے میں لطف آرہا تھا۔ بشن سنگھ نے آلتی پالتی مارتے ہوئے سکھی رام سے کہا کہ میں جو قصّہ سُنانے جارہا ہوں اُسے سننے سے پہلے اپنا دل ضرور تھام لینا''۔۔ لیکن اب سکھی رام سنجیدہ ہوگیا تھا۔۔۔ اور سننے کی دھن میں تھا۔ پنڈت بھی بتانے لگے۔۔

''ہاں تو رفیق نے مجھے بتایا کہ جیسلمیر میں پریمی اپنی پریمکا سے ملنے کا سمے جب طے کرتا ہے تو وہ ایک رومال میں بہت سا عطر لگا کر پہلے تو اُسے خوب مہکاتا ہے۔ پھر اُس میں دو الائچی، دو کالی مرچ، دو نقل (جسے لوگ مکھانے بھی کہتے ہیں) اور دو مصری کی ڈلیاں باندھ کر، پریمکا کے گھر میں چوری چھپے، دیوار کے سہارے چڑھ جاتا ہے۔ اور آنگن یا چھت پر اُس رومال کو پھینک دیتا ہے۔ پریمکا تو اس رومال کی ٹوہ میں رہتی ہی ہے۔ وہ کسی طرح اُسے ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ اُسے کھولتی ہے تو، اُن دو دو کا مطلب ہوتا ہے۔ رات کے دو بجے کہیں باہر ملنا۔ اُس سوکھے نالے کی پال پر۔۔ جو کبھی کبھی برسات میں اپنے پورے یوون پر ہوتا ہے۔۔ سمجھے سکھی رام'۔۔ بشن سنگھ اب جوانی کے عالم میں پہنچ گئے تھے۔ اور ایک لمحے کے لئے وہ زنان خانے میں بھی پہنچ گئے اور دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ آج رات تو زنان خانے میں۔۔۔ اور سکھی رام نے انہیں چونکا دیا۔

''پنڈت، اتنی مزے دار بات اب بتا رہے ہو۔۔ تمہارا کیا جاتا، اگر کچھ سال پہلے ہی بتا دیتے۔۔ اُسے موتیا بند ہونے سے پہلے''۔۔۔ تینوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

سکھی رام نے اس لطف اندوزی کے عالم میں پنڈت جی کو چھیڑا۔ ''یار پنڈت۔۔۔ بڑے چٹخارے بھر بھر کے تم نے سنایا۔۔ کہیں کوئی اپنی بھولی بسری تو یاد نہیں آگئی''۔

''کیا کریں سکھی رام''۔۔۔ انہوں نے 'رام' کو زور سے کھینچا اور آلتی پالتی کھول کر، اکڑی ٹانگوں کو سیدھا کرتے ہوئے تھوڑا منھ بنایا۔ پھر شوخی سے بولے۔۔

''بھئی سکھی رام۔۔ اب اس عمر میں کچھ کر۔۔۔ دھرنے کے تو رہے نہیں۔۔۔ ساری طاقت زبان

میں آگئی ہے۔۔سو وہی سہی''۔۔انہوں نے اللہ رکھا کو آنکھ جھپکائی۔۔۔اللہ رکھا مسلسل مسکرائے جا رہے تھے۔

پھر کیا ہوا پنڈت، آگے کی تو کہو''۔۔سکھی رام نے بات کا دھارا پھر موڑا۔

''ہونا کیا تھا۔۔وہی ستیاناس۔۔جو ایسے پریم کا ہوتا ہے۔۔رفیق کے بڑے بھائی کو اس کی بھنک لگ گئی۔۔۔آپا کھو بیٹھا اور لوک لاج کی خاطر گنڈاسا لے، گردن اڑا دی، رن ویر کے پتر کی۔۔بس ٹھن گئی۔۔۔دونوں کنبوں میں۔۔اس کی بہن کی عزت رن ویر نے اپنے لونڈوں سے لٹوا کر۔۔لاش ٹکڑے ٹکڑے کر۔۔۔اُسی سوکھے نالے میں دبا دی۔۔اور دیس نکالا دلوا دیا۔۔پورے خاندان کو۔بس انھیں کوئی اور ٹھور نہ ملا۔دیوی کے چرنوں میں آ گئے۔یہ بھی آدھے ہندو تو ہوتے ہی ہیں۔۔چلے آئے ادھر کو۔۔میں نے بھی انسانیت کے ناطے۔۔لوگوں کے ورودھ کے باوجود پناہ دے دی۔۔میں نے کیا بلکہ دیوی نے پناہ دی۔

پنڈت بشن سنگھ نے سر کھجاتے ہوئے اپنی بات ختم کی اور پھر سے تینوں نئی صورتِ حال پر غور و فکر کرنے لگے کہ۔۔۔آہٹ ہوئی۔۔دیکھیں تو لمبے چوڑے ڈیل ڈول کا، تھکا تھکا سا سراپا ان کی جانب بڑھ رہا ہے۔

''لو۔۔۔اس سانڈ کی اور کمی تھی۔۔۔یہ بھی آ گیا۔۔۔ان کی الگ کہانی ہے''۔۔اب کی بار سکھی رام نے روپ پیشور سنگھ کو آتے دیکھا تو اُسے راز کھولنے کی سوجھی۔۔۔اس مرتبہ اللہ رکھا کی باری تھی، چونکنے کی۔انہوں نے سکھی رام اور پنڈت کے ساتھ ساتھ روپ پیشور سنگھ کو بھی دیکھا۔دونوں کی نظروں میں شوخی تھی۔اور روپ پیشور سنگھ ان سب کی باتوں سے بے نیاز، نپے تلے قدموں سے ان کی جانب چلا آ رہا تھا۔

''آؤ روپیش''۔پنڈت جی نے کھانے کی پائینتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔

''نمسکار۔۔بھئی کیا گپ شپ ہو رہی ہے۔''

ا۔رانڈیں بھنیا نزیں سا، ان کی کُل دیوی ہیں انہیں کے مندر میں یہ بھجن کیرتن کرتے ہیں۔

''آؤ بیٹھو۔۔۔دیر سے آئے۔۔۔وہی رفیق الدین مانگڑیا کی بہن کی کہانی بتا رہا تھا، اسے سکھی رام کو۔'' انہوں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھاں ہاں ہاں۔۔ بھائی میں بھی تو اُدھر کا ہی ہوں۔ دیوی کرنی کی کرپا ہوئی تو ان کے چرنوں میں آگیا اب تو بھگوان سے یہی پرارتھنا ہے کہ ''کابا'' بنا کر جنم دے دے تو سُورگ کے ادھیکاری ہو جائیں۔ ورنہ اپنا بھوت کال تو نرک میں دھکیل دے گا''۔

سکھی رام کے 'سانڈ' کہنے اور روپیشور کے 'بھوت کال' والی بات سُن کر اللہ رکھا نے سرگوشی کی'' بھلا یہ سانڈ والی کیا بات ہے''۔۔ کیا اس کی بھی کوئی کہانی سُنانے جا رہے ہو۔ آج کس کا منہ دیکھا تھا بڑے مزے مزے کے راز کُھل رہے ہیں''۔ اللہ رکھا کا تجسس عروج پر تھا۔ وہ اپنی کرسی میں کسمسائے اور ضِد کرنے لگے کہ روپیشور کی بھی کوئی کہانی ہے، جو انہیں سنائی جائے۔

''کیا کرو گے خان۔۔۔ عمر تو بیت گئی۔۔۔ میری کہانی سُن کر چھپتاؤ گے۔۔۔ باسی کڑی میں اُبال نہیں آنے کا''۔

روپیشور سنگھ کو اپنے ماضی پر فخر بھی تھا اور پچھتاوا بھی۔۔۔ لیکن اس وقت تو ماحول ہی کچھ ایسا خوشگوار اور شوخ تھا کہ وہ بھی اس شوخی میں شریک ہو گیا۔۔ خان تو جیسے بے چین ہو گئے۔۔ ننھے بچے کی سی ضِد کر کے بولے۔۔

''اونہہ، جلدی سُناؤ اپنی کہانی۔ صحیح کہہ رہا ہوں۔۔۔ ایسی گھڑیاں بڑے دنوں میں نصیب ہوا کرتی ہیں۔ وہ اپنی کُرسی سرکاتے سرکاتے روپیشور کے بالکل قریب لے آئے اور منتظر ہو اُن کا منہ تاکنے لگے کہ اب بول پھوٹیں اب بول پھوٹیں۔

ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر تینوں دوستوں نے خوب مزے لئے۔ آخر روپیشور نے پنڈت جی سے کہا۔۔ ''یار بشن سنگھ۔۔ تو ہی سُنا۔۔ تیری بات میں لچھا ہوتا ہے۔۔

بشن سنگھ تو جیسے پھول گئے۔ ایسے سنبھل کے بیٹھے، جیسے لڑکپن کا بانکا۔۔۔ اور بڑے گد گد ہو کر اللہ رکھا سے مخاطب ہوئے۔

''یہ اپنا روپیشور جس جاتی کا ہے نا، اُس جات میں ایک پرتھا پرچلت ہے''۔

''کون سی پرتھا۔ کھل کر جلدی جلدی بتادو۔۔ بتانا ہوتو''۔ خان نے بے صبرے ہوتے ہوئے مصنوعی غصّے کا اظہار کیا۔

''بے صبرے، بتا تو رہا ہوں۔۔ دھیرج رکھ۔۔ جلدی میں مزہ نہ آنے کا۔'' سب مسکرانے لگے لیکن خان کی حالت بالکل ایسی ہوگئی جیسے کھانے کی پہنچ سے دور رال ٹپکا تا کتا۔۔۔ بشن سنگھ نے بیڑی کا بنڈل اور ماچس تکیے کے نیچے سے نکال کر سکھی رام کو دیا۔۔ اور خود سائڈ ٹیبل پر رکھا حقّہ گڑگڑانے لگے۔۔ پھر دھنواں چھوڑتے ہوئے بولے:

''بات یہ ہے خان کہ پوری برادری سے سب مرد مل کر ایک ایسے نوجوان کو چُن لیتے ہیں جو ہر کسوٹی پر پورا اُترتا ہے''۔

''یعنی۔۔۔'' اللہ رکھا کی پیشانی پر اُلجھن کے آثار نمودار ہوگئے۔۔ سکھی رام نے بیڑی سُلگا لی لمبا کش کھینچ، اللہ رکھا کی حیرت سے لطف اٹھانے لگے۔ روپیشور سنگھ پُشت پر گول تکیہ رکھ کر آرام سے ادھ لیٹی صورت میں مند مند مسکرا رہے تھے۔

''یعنی یہ کہ وہ نوجوان لمبا، چوڑا، تندرست، گوراچٹا، عقل سے بھرا، کسی سے نہ ڈرنے والا، ہوشیار، سُندر۔۔ غرض یہ کہ سبھی مردانہ خوبیوں والا ہونا چاہئے۔ جس مرد میں یہ سب ہوتا ہے، وہ برادری کا سب سے سُندر پُرش چن لیا جاتا ہے۔ پھر شروع ہوتی ہے اس کی نئی اور انوکھی زندگی۔۔ وہ برادری کا چہیتا تو ہوتا ہی ہے، جوان لڑکیوں کے سپنوں کا راجکمار بھی ہوتا ہے۔ اب چاہے لڑکی شادی شدہ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اس کو وہ بھا جائے تو اس اِستری کا پتی خود، اپنی بیوی کے ساتھ سونے کی کھُلی دعوت اُسے دے ڈالتا ہے۔۔ تاکہ اس کے یہاں اچھی نسل کا بیٹا پیدا ہو۔

''گویا مرد کی تکمیل۔ اچھی نسل کے بیٹے کا باپ کہلانے پر ہوتی ہے۔۔ اور اگر بیٹی ہوگئی تو۔'' اللہ رکھا کی آنکھیں پھٹی تھیں اسی میں اس نے سوال کر ڈالا۔

''بیٹی ہوتو، یہ لوگ اُسے جینے نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں کے مقابلہ

بہت کم ہے۔"

"کیا عورت کی تکمیل کا بھی کوئی پیمانہ ہوتا ہے یا بس اس کی زندگی کے پیچھے ہی ہاتھ دھوکر پڑے رہتے ہیں"۔ خان صاب اب جذباتی ہونے لگے۔

"نہیں۔ ان میں تو نہیں۔ پر تم نے بات اچھی پوچھی ہے۔۔ اور پنڈت کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"رامایڑ کال، مہابھارت اور پُرانوں کے زمانے میں ایک پرتھا بڑی عام تھی اسے "نیوگ" کہتے تھے۔ خان کے ساتھ وہ دونوں بھی پنڈت جی کو اب دھیان سے سننے لگے۔ پنڈت نے اپنی کتھا سُنانے والے انداز میں، دوست سے ودوان کا روپ لیتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہوتا تھا کہ اگر مرد، بچہ پیدا کرنے لائق نہیں ہے تو اس کی بیوی کو یہ ادھیکار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی پسند کے کسی بھی مرد سے، چاہے وہ رشی یا مہاپُرش ہی کیوں نہ ہو۔ جنسی رشتہ قائم کر کے، ماں بننے کی مراد پوری کر سکتی تھی۔ اور ماں بننا، ہر استری کا حق تھا۔ اُسے تب ہی مکمل مانا جاتا تھا۔ سماج نے اس پرتھا کو پوری طرح مانیتا دے رکھی تھی۔ خود دشرتھ نے شرنگی رشی کو مدعو کر کے "پتر شٹی یگیہ" کے ذریعے اولاد حاصل کی تھی"۔

"ہو سکتا ہے، جیسلمیر کی یہ پرتھا اسی کا بگڑا روپ ہو"۔ سکھی رام نے سب کی طرف دیکھا۔

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی"۔ پنڈت جی نے حقہ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا اپنا روپیشور ایسا ہی نوجوان رہا ہے"۔ خان کے معلومات میں اضافہ چاہا۔

"ہاں! یہ لوگ ایسے نوجوان کو "سانڈ" کی طرح مانتے ہیں۔ اچھی نسل پیدا کرنے کا ذریعہ۔۔ اُس وقت تو اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوتی ہیں۔۔ اور جوانی شہد میں ڈوبی لگتی ہے۔۔ پھر ادھیڑ ہوتے ہوتے ساری مکھیاں اُڑ جاتی ہیں۔۔۔ اور بڑھاپا آتے آتے دوسرا "سانڈ" تیار کر لیا جاتا ہے۔۔۔ اب پہلے والے کا بڑھاپا تو ہوا نہ خراب۔۔۔ وہ بس بوڑھے سانڈ کی طرح سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہے"۔۔ بشن سنگھ یہ کہتے کہتے اُس مرحلے تک پہنچ گئے جہاں پیری میں تحفظ کا مسئلہ زندگی کا سب سے بڑا سچ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اللہ رکھا کی تو حیرت کی انتہا نہ تھی۔۔۔ سکھی رام بھی

کچھ افسردہ سا لگ رہا تھا۔۔۔ تینوں نے مزے مزے میں یہ باتیں تو کرلیں، لیکن بات جہاں آ کر ختم ہوئی، اس کی گہرائی کا اندازہ، اُس وقت ہوا، جب انہوں نے روپیشور کو سسکتے دیکھا۔

ان کے درمیان ایک سناٹا سا چھا گیا۔ تینوں پشیمان۔۔۔ ایک دوسرے کی طرف ہونقوں کی طرح دیکھتے ہوئے۔ لیکن پھر انہوں نے روپیشور سے انجانے میں ہوئی نادانی پر معافی مانگی، اُسے دلاسا دیا۔۔ ان کی اس تدبیر کی بنیاد میں پوشیدہ شرمندگی اور پشیمانی کو محسوس کرتے ہوئے روپیشور نے آنسو پوچھے اور صرف اتنا کہا۔۔

مجھے تو دیوی ماں کے چرنوں میں جگہ مل گئی۔۔۔ باقی کا کیا ہوتا ہوگا۔۔۔ سوچو ذرا۔۔ کہنے کو ہم جیسوں کی کئی اولادیں ہوتی ہیں۔۔۔ لیکن پھر بھی ہم اکیلے کے اکیلے۔۔۔ تمھیں کسی کو معلوم نہیں۔۔۔ میں ایچ۔ آئی۔ وی پوزیٹیو ہوں۔۔ بس دن گن رہا ہوں''۔

''یہ ایچ۔ آئی۔ وی۔۔ کیا کہا۔۔ یہ کیا ہوتا ہے روپیش۔۔ پھر سے بتا میرے یار۔۔ اندر ہی اندر رکیوں گھٹتا ہے''۔۔ تینوں کے منہ سے تقریباً ایک ساتھ نکلا۔۔

''ایک سے زیادہ سے ہم بستری کا نتیجہ ہے یہ بیماری۔۔۔ اس کا علاج ہی نہیں ہے کوئی۔۔۔ روپیشور کی تو ہچکیں لگ گئیں۔۔ وہ روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا، نہ جانے ہمارے سماج میں یہ گندی پرچھائیں کس نے ڈالی۔۔ ہم کھل کر بتا بھی نہیں سکتے۔۔ نہ کھل کر وِرودھ کر سکتے۔ سب کچھ چُپ چُپ ہوتا ہے''۔ روپیشور سنگھ نے رومال نکال کر اپنے آنسوں اور ناک پونچھی۔

بشن سنگھ نے نندورام کو آواز لگائی جو ابھی ابھی رتن سنگھ کی جی حضوری سے نبٹ کر آیا تھا۔ ''نندورام، ذرا جل پلا''۔

سب نے مل کر روپیشور سنگھ کو پانی پینے کا اِسرار کیا۔ پھر ان تینوں نے بھی گلا تر کیا۔ آخر اس ناتوانی کے عالم سے نکلنے کے لئے روپیشور سنگھ نے خود پہل کی۔۔۔ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔

''یہ بات نہیں ہے کہ میں اپنی زندگی سے ناخوش ہوں۔۔ یا مجھے کوئی شکایت ہے۔۔ ہاں کبھی کبھی،

پچھتاوا ضرور ہوتا ہے۔ پر اس بات پر گرؤبھی ہوتا ہے کہ ''میں اپنی برادری کا سب سے گرویل نوجوان ہوا کرتا تھا''۔ یہ کہتے کہتے انہوں نے غیر شعوری طور پر لمبی، نکیلی مونچھوں پر کہ جن کے، نہ اور کا پتہ چلتا تھا نہ چھور کا۔ فاتحانہ انداز سے ہاتھ پھیرا۔ گوری چمڑی پر کچھ سُرخ ڈورے تیرنے لگے۔ بوڑھی آنکھوں کے کھنڈر بتا رہے تھے کہ ان آنکھوں نے کتنی حسیناؤں کو گھائل کیا ہوگا۔ اُن میں جگنو کی طرح چمک آئی اور گئی۔۔ پھر تینوں دوستوں نے اُس چمک کو محسوس کیا اور روپیشور کو کہنے دیا جو وہ کہنا چاہتے تھے۔۔ وہ کہتے گئے۔۔ کہتے گئے۔۔ یہ سنتے رہے، سنتے رہے۔۔ یہ

''مجھے وہ شہر چھوڑے کوئی بیس بائیس سال ہونے کو آئے۔ پر وہاں کی سنہری دھرتی بھلائے نہیں بھولتی۔۔۔ بالکل سونے کی مانند۔۔ جھل جھل کرتی ہوئی، آج بھی من میں پیڑ جگا دیتی ہے۔ وہ بالو[1] ریت کے دھورے (ٹیلے)، وہ مٹی کے میرو (پہاڑ)۔ وہ اُس پر بنا نیناوے بُرجوں والا سنہری پتھر کا قلعہ، کہ جسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے گویا اب بھر بھرا کر گرا۔۔ اب گرا۔۔ وہ اُگتے سورج کی کرنوں میں لپٹا، دھرتی کا جوبن، وہ سنہری بالو کے دھوروں پر سرسراتی، لہریں بناتی صبح و شام کی ٹھنڈی بیار[2]۔۔ وہ دن کے بارہ بجے بیار کا مضطرب روپ کہ دھوروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اُڑا کر لے جانا کہ گویا وصل کی چاہت میں دھرتی کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی ہو، وہ سنہری پتھروں سے تراشے محراب دار گھروندے، وہ دور دور تک پھیلا چٹیل میدان۔۔ میدان میں کٹیلی جھاڑیاں، جھاڑیوں میں دوڑتے، دبکتے تیتروں کے جھنڈ، قلانچے بھرتے کالے ہرن۔۔۔ وہ اونٹوں کا قافلہ۔۔ وہ سنہری ذرّات۔۔ وہ اُن کی حرارت۔۔ حرارت میں سوز۔۔ سوز میں زندگی۔۔۔ زندگی میں مشقت۔۔۔ مشقت میں سُرور۔۔۔ سُرور میں نغمگی۔۔۔ وہ بھجنوں کی بھور، وہ پائل کی جھنکار۔۔۔ وہ ریاز[3] کی منوہار۔۔ وہ موس مکا ساگ۔۔ وہ بیلی سنگتی[5]۔۔۔ وہ کوڑیہ[4]۔۔ وہ بابُر[6]

۱۔ جیسلمیر کی سنہری ریت کو ''بالو'' کہتے ہیں۔ یہ پیڑے خراب نہیں کرتی بلکہ پھسل کر جھڑ جاتی ہے۔

۲۔ ہوا ۳۔ افیم ۴۔ بکرے کا گوشت ۵۔ دوست احباب۔۔۔ ۶۔ بارات آنے کے بعد کھانا ہوتا ہے۔ جس میں دونوں طرف کے افراد ایک دوسرے کے منہ میں نوالے دے کر رشتے کی مضبوطی کا اظہار کرتے ہیں۔

۷۔ جیسلمیر کے پاس ایک گاؤں کا نام۔ یہاں کے پتھر کی خاصیت ہے کہ اُسے دودھ میں ڈال دیں تو چار گھنٹے میں دہی جام جاتا ہے۔

کے پتھروں سے جمع دہی۔۔ وہ مرد میلا[1]۔۔ وہ اس کی دھمک۔۔ وہ مہندر[2] اور موّمل کی پریم کہانی،،وہ گوربند بناتی، وِرّہ میں جلتی گوریاں۔۔ وہ چوڑوں سے ڈھکی چھپی کلائیاں۔۔۔وہ بانہیں۔۔ وہ کنڈورا[3] سے بجی سنوری، جھنکار کرتی لچکتی کمریا۔۔۔ وہ دِلرُبا سارنگی کی تان پر تھرکتی لوک گیت گاتی حسینائیں۔۔۔ وہ خان زری کی دَھمک۔۔ وہ جَل تال کی کھنک[4]۔۔۔ واہ، کیا رنگینی تھی میرے وطن میں بھایا میں نے تو جیون کا بھرپور آنند اُٹھایا۔۔۔اور پھر یہاں دیوی نے تم جیسے دوستوں سے ملوادیا۔۔اور کیا چاہئے''۔۔ جیسے ہی روپ پیشور سنگھ نے بات ختم کی اللہ رکھا خاں کے منھ سے واہ واہ کے تعریفی کلمات ادا ہوئے۔

''واہ واہ! روُپ پیشور۔۔کیا سماں باندھ دیا۔۔۔تم نے تو ہمیں سب کو رومان کی شیرینی سے حقیقت کے مضبوط دھراتل پر لا کھڑا کیا۔۔۔اپنے راجستھان اور خاص طور سے ادھر مارواڑ کی آب وہوا، یہاں کی بنجر دھرتی جس قدر کمرتوڑ محنت کرواتی ہے، اسی قدر انسان نے اس سے لوہا لینے کے لئے اپنی زندگی کو رنگین بنا کر، آسان کرلیا ہے۔ بھیّا اگر مارواڑ نہ دیکھا تو سمجھو کچھ نہ دیکھا اور جو، دیکھ لے تو قسم خدا کی وہ پائے جو کہیں نہ ملے''۔۔اللہ رکھا نے کھڑے ہوئے ہوئے اس خطّے کی تعریف کی۔۔انہیں کے ساتھ سکھی رام نے بھی یہ کہتے ہوئے کرسی چھوڑی کہ''ہاں بھئی یہ تو ہے، پر اب چلا جائے۔۔۔دھوپ چڑھ گئی ہے۔آج بہت دیر ہوگئی''بہت سمے بیت گیا''۔۔سب نے اثبات میں گردن ہلائی اور بشن سنگھ سے وداع لیکر ساتھ ساتھ باہر نکل گئے۔

--

ا۔ماہ فروری میں ہر سال میلا لگتا ہے جسے "Deset festivel" کے نام سے جانا جاتا ہے۔دس دن کے اس میلے میں دنیا سے لوگ آتے ہیں اور بہار دیکھنے لائق ہوتی ہے یعنی یہاں کے کلچر سے ہم روبرو ہوتے ہیں۔

۲۔ان دونوں کی محبت کی داستان تقریباً گیارہویں صدی ہجری کی ہے۔کہا جاتا ہے کہ موّمل، چنا چوہان کی بیٹی تھی۔مہندر،اُمرکوٹ سے اونٹ پر بیٹھ کر آتا تھا۔

۳۔کنکتی۔کمر کا زیور

۴۔پیتل کی تھالی میں پانی ڈال کر،اس کو مٹی کی بنی مٹکی کے ڈھکن سے ردم پیدا کی جاتی ہے۔یہ ڈھکن بھی مٹی کا ہوتا ہے۔)(musical instruments)--

(باب ۱۱)

روپی کو اپنی محنت پر پورا بھروسا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ پرمیلا کے آشرم میں بھی اُس نے جانا بند کر دیا تھا۔ خود پرمیلا کا بھی یہی حال تھا۔ ایسا لگتا تھا اُن کا مقصد ہی اُنکا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ارادوں کے تیز دھاروں نے اُن میں توانائی کے احساس کو قوی تر کر دیا تھا۔

اور پھر۔۔۔امتحان ہوئے۔۔۔نتیجہ آیا۔۔۔روپ کنور نے اول دس کی فہرست میں پانچواں مقام حاصل کیا اور پرمیلا نے دسواں۔۔۔دونوں کو بآسانی ایک ہی میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ راج کنور اور دیوندر سنگھ کی خوشی کا تو ٹھکانا نہیں تھا۔ راج کنور نے مٹھائیاں بانٹیں، کرنی ماتا کے مندر خیرات پہنچائی، دان پیٹی کی رقم میں اضافہ کیا۔۔اور بس اترا اترا کر ہر جگہ، ہر محفل میں روپی کی کامیابی کا ذکر کرتی تو کرتی ہی چلی جاتیں۔۔کوئی سُن رہا یا نہیں۔۔پھر انہیں ہوش نہیں رہتا۔۔۔!

حویلی میں بھی ڈھکے چھپے خوشیاں منائیں گئیں۔۔۔دادی نے اپنے آپ کو تسلی دی۔۔

''تیری پوتی نے دم گھٹتی رانڈ بننے کے لئے جنم نہیں لیا۔۔ماتیشوری، وہ کرنی ماتا کا اوتار ہے اوتار۔۔۔بھول جا تو، اپنے قاعدے قانون۔۔جینے دے اُسے اپنی اچھا سے''۔۔۔

اور روپی کے والدین تو جیسے دھنیہ ہو گئے۔۔بہن، بہنوئی کے لئے دل میں بے حساب عقیدت اور خلوص کا جذبہ پنپ گیا۔۔۔انہیں لگا۔۔۔''ہم زندگی بھر بھی دونوں کی خدمت کریں تو، یہ احسان نہیں اُتار سکتے۔۔۔''۔

دادا، چچا، چچی، بھائیوں، سبھی کو مسرّت ہوئی لیکن اظہار کرنے سے زبان قاصر ہی رہی۔۔۔ وجہ۔۔''زیادہ چرچا ہوا تو راز نہ کھُل جائے''۔گھر کے کسی ملازم تک بھی بات پہنچ گئی تو، سمجھو آگ کی طرح قصبہ میں پھیلی۔۔۔لیکن روپی دھوپی کو سب معلوم تھا۔وہ دونوں روپی کی اس کامیابی سے اس قدر خوش تھیں کہ جب یہ خبر کھُسر پُسر ہوتے ہوئے ان کی سماعت سے ٹکرائی تو دونوں فرطِ مسرّت سے ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔۔۔وفا شعار اتنی تھیں کہ گھر والے چاہے سمجھیں یا نہ سمجھیں۔۔وہ ضرور نمک کا حق ادا کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔اور راز کو راز رکھنے میں اپنا خاموش تعاون دے رہی تھیں۔۔۔چنانچہ اُس سہ پہر جب تمام کاموں سے فارغ ہوئیں تو، جھٹ کرنی ماتا کے مندر جا، ناریل پھوڑا۔۔۔چوہوں کو ایک ایک دونا، دودھ پلایا۔۔۔اور کیوں نہ پلاتیں۔۔۔ہوش سنبھالا تو اسی حویلی میں۔۔۔کون ماں باپ ہیں، انہیں نہیں معلوم۔۔۔ایک بار دھونی نے ہمّت کر کے دادی سے پوچھا تھا، انہوں نے پہلے تو جھڑکی دی، پھر بتایا۔۔

''تم دونوں جُڑواں بہنیں ہو، گھیسی لائی تھی، اپنے مائکے سے۔۔اُسی نے پالا پوسا۔۔بیچاری سمے سے پہلے ہی ہیضے سے چل بسی۔۔بس گرتی پڑتی پل گئیں''۔

''یہ گھیسی کون تھی''۔روپی نے اشتیاق سے پوچھا۔دادی نے پھر اُسے گھوُرا۔۔

''اتنے سوال نہ کیا کر۔۔تجھے کیا مری، بڑبڑ کرتی رہتی ہے۔۔تھی ہماری پُرانی نوکرانی۔۔اب جا، اپنا کام کر''۔انہوں نے روپی کو گھڑکی دی تو دھونی بھی کھسک لی تھی۔بس دونوں اپنے بارے میں اتنا ہی جانتی تھیں۔

راج کنور نے ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا۔۔جس میں شہر کے بڑے بڑے لوگوں کو مدعو کیا گیا۔دیش نوک سے روپی کے والدین آئے تھے۔بیٹی کی ترقی، بہن کی شفقت اور بہنوئی کی بےلوث محبت نے پنڈت رتن سنگھ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ''روپی نے غلط جگہ جنم لے لیا''۔۔اور سبھدرا تو جیسے پھولی نہیں سماتی تھیں۔کہاں دیش نوک کی دم گھوٹو حویلیاں، بوجھل فضا، تاریکی کی حکومت اور کہاں یہ روشن خیالی، زندگی کی رنگارنگی، ترقی کے خوشنما قُمقُمے، کامیابی کے ولولے، ارتقا۔

کے جھلملاتے کارواں۔۔۔اور۔۔۔اس کارواں میں سالار کی حیثیت سے آگے بڑھتی ان کی بٹو"۔۔سمھدرارانی کی آنکھوں میں آنسو تھے کہ اُمڑے آتے تھے۔۔۔چھلاتی آنکھیں، آشیرواد سے لبریز دل۔۔اور بیٹی کے روشن مستقبل کی آمد آمد۔سمھدرارانی نے فوراً دل ہی دل میں کرنی ماتا کو دھنیواد دیا۔اوران کی آنکھیں عقیدت سے بند ہوتی چلی گئیں۔

سفید کارچوبی لہنگا چنی میں ملبوس روپ کنور نے اپنی پھوپی سے اپنی سہیلیوں کا تعارف کروایا۔

"بُوا سا! اس سے ملئے۔۔یہ ہمارے سینٹر کی سب سے Intelegent Sudedent کُسُم ہے۔میرٹ میں تیسراا ستھان ملا ہے اس کو۔۔اور یہ پرمیلا ہے، رِتو ہے، یہ راحیل۔۔یہ رشمی"۔۔ روپی تھی کہ اپنی منڈلی کے تعارف میں لگی تھی اور راج کنور۔۔۔ان کی نظریں تو بس کُسُم پر جم کر رہ گئی تھیں۔۔کیا ملکوتی حُسن تھا۔۔عقل اور حسن کا بے مثال مُرکّب۔۔۔اپنی طرف، راج کنور کو اس طرح نہارتے ہوئے دیکھ کر کُسُم کے شفاف چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔اُس نے کچھ شرماتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر بڑی شائستگی سے نمستے کیا۔۔تو راج کنور کو کچھ ہوش آیا۔۔۔

"نمستے بیٹی۔۔۔کہاں رہتی ہو۔۔۔کہاں کی ہو"۔۔

روپی نے بُوا کو کُسُم میں دلچسپی لیتے دیکھا تو پھوپی کے مقصد کو کچھ کچھ بھانپتے ہوئے وہ اُس کا باقاعدہ تعارف کرانے لگی۔

"بُوا سا! یہ حیدرآباد کی ہے۔ان کی پتاشری، مسٹر شِو نارائین وہاں ایک ہائی اسکول چلاتے ہیں۔ تین بہنوں میں سب سے چھوٹی ہے۔۔۔دو کی شادی ہو چکی ہے۔۔ایک انجینئر ہیں اور دوسری لکچرر۔۔اور یہ ڈاکٹر بننے جارہی ہیں"۔۔۔روپی نے شوخی سے کُسُم کے شانے پر زور کا ہاتھ مارا۔۔۔اور یہ ٹولہ ہنستا مسکراتا آگے بڑھ گیا۔۔۔اُدھر راج کنور کو کسی کام سے، بڑے بیٹے اشوک نے بلوالیا۔۔۔وہ بیٹے کے پاس پہنچیں تو اُس کی بات سُنے بغیر پہلے اپنی بتانے لگیں۔۔۔

"پر ماں، میری بات تو سنئے"۔

''پھر سنا لینا۔۔۔اپنی بات۔۔۔ پہلے اُس لڑکی کو غور سے دیکھ لو بیٹا۔۔مجھے تو پسند آ گئی، بالکل تمہارے جوڑ کی ہے۔ٹھیک ٹھاک گھرانے کی ہے، ہمیں دولت تو چاہئے نہیں۔۔۔ سُشیل، سمجھدار اور سُندر بھولانی ہے۔میں نے جیسا سوچ رکھا تھا، بھگوان نے وہ اِچّھا آج پوری کر دی۔۔۔واستو میں آج کا دن بڑا ہی شُبھ ہے''۔راج کنور ایک سانس میں بولے چلی جا رہی تھیں اور بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتی ہوئی اس ٹولے کی جانب لے کر جانے لگیں۔

''اچّھا ماں۔۔۔ چلتا ہوں۔۔۔ پہلے میری بات تو سنو۔۔بات تو سُنو''۔۔ کہتے کہتے اشوک کے قدم بھی جلدی جلدی اُسی طرف بڑھنے لگے۔آج پہلی مرتبہ اس کی ماں کو کوئی لڑکی پسند آئی تھی۔۔ چنانچہ وہ یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔۔۔اور جب۔۔۔ کُسم کو دیکھا تو، دیکھتا ہی رہ گیا۔۔۔

''کہاں چھپے رہتے ہیں یہ حسین مجسمے۔۔۔ہے بھگوان، تیری لیلا اَپرم پار ہے''۔تحیّر و تجسّس نے اس کے حواس پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

''کہاں کھو گئے بھیا!'' روپی نے بھائی کے کندھے کو ذرا زور سے ہلاتے ہوئے چٹکی لی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شرارت سے دیکھا۔۔۔اس کے اس عمل پر سب محظوظ ہوئے۔۔لیکن کُسم تو مارے شرم کے گڑھی جا رہی تھی۔۔۔لاکھ کچھ کرو۔۔لیکن مشرقی ذہنیت میں شرم و حیا کا اپنا مقام ہے۔کہ اتنے میں بیرے نے کولڈ ڈرنک کی ٹرے آگے کر کے کُسم کی پریشانی حل کر دی۔سب چسکیوں کے ساتھ گپ شپ کرنے میں لگ گئے۔راج کنور تو بیٹے کے تاثرات کا اندازہ لگا کر پہلے ہی وہاں سے کھسک لی تھیں۔۔۔اور شوہر کو تلاش کر کے سارا ماجرا کہہ سُنایا۔۔انہوں نے بھی لڑکی کو نظر بھر دیکھا اور اپنی رضامندی دے دی۔روپ کو بھی راج کنور نے موقع دیکھ کر علیحدہ بُلا کر اپنی اور سب کی خواہش بتا دی۔وہ بھی اس فیصلے پر خوش ہوئی۔کہنے لگی۔

''بُوا۔۔اگر روی بھیا ہوتے تو وہ بھی اپنی بھابی کو پسند کر لیتے۔''

''ہاں یہ تو ہے، پر اُس کا جانا بہت ضروری تھا۔ڈیل ہی ایسی تھی''۔وہ کچھ اُداس ہو گئیں۔روپی نے

ایک لمحہ میں سوچا۔ ''یہ میں نے کیا کیا۔ بیٹھے بٹھائے یاد دلادی''۔ اس نے اپنی غلطی کا تدارک کرنے کے لیے فوراً جھکتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کے بھیا بھابی کہاں ہیں، نظر نہیں آرہے'' راج کنور کا دھیان واقعی میں، اس سوال پر ہٹ گیا۔ اور وہ ''ابھی تو یہیں تھے'' کہتے ہوئے نظروں سے ان کا تعاقب کرنے لگیں کہ دیوندر سنگھ اپنے ایک دوست کو ساتھ لئے اُن دونوں کے قریب آکر تعارف کرانے لگے۔

کمرہ میں آکر کپڑے تبدیل کرتے ہوئے انہوں نے بیوی سے بڑی تشویشناک لہجے میں روپی کی بے تکلفی کو لے کر بحث بھی کی تھی، لیکن سہد رارانی نے بڑی عقلمندی سے شوہر کو سمجھایا کہ ''بڑے شہروں کی سنسکرتی اور سنسکار، گاؤں، قصبوں سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ پھر بمبئی کا تیزی سے کامیابی کی طرف گامزن ہونا، اس کے بگڑنے کی دلیل نہیں ہے۔ انہوں نے شوہر کے نزدیک بیٹھ کر اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بڑی نرمی سے گویا ہوئیں۔

''خواہ مخواہ کے شک وشبہات کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں۔۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، تو بلا وجہ کی ٹینشن کیوں؟''

''اگر کہیں، ان رنگ رلیوں کا پتہ دیش لوک واسیوں کو چل گیا تو۔۔۔ کہیں منہ دکھانے لائق نہیں رہوں گا۔''

''پہلی بات تو یہ کہ آپ اسے رنگ رلیاں نہ کہیں۔۔ آپ خوب جانتے ہیں، رنگ رلیاں کیا ہوتی ہیں۔۔ دوسری بات یہ کہ، انہیں کون کہے گا۔۔ سوائے اپنوں کے۔۔ اور اپنوں میں کوئی ایسا نہیں۔۔۔ پھر خطرہ کاہے کا۔۔۔؟''

دونوں نے اسی اُدھیڑ بُن، بحث ومباحثہ میں نہ جانے کتنا وقت گزار دیا۔ آخر کار، کچھ مخصوص جتن کر کے، سہد را اپنے شوہر کو میٹھی اور بے فکر نیند سُلانے میں کامیاب ہوگئیں اور خود بھی اُن کی، سیدھی بانہہ پر سَر رکھ، ہاتھ سے سینے کو سہلاتے سہلاتے، گھنے گچھوں کی چھاؤں میں، نہ جانے کب پتی سُکھ سے سیراب ہوتے نکل گئیں۔

اُدھر محفل پوری رونق پر تھی۔ کچھ تو ٹُن ہوئے الٹا سیدھا کھانا کھا رہے تھے۔ کچھ اپنی بیویوں اور کچھ اپنے شوہروں سے بیزار، دوسرے کی بیویوں اور شوہروں کو رِجھانے میں لگے تھے۔۔ چند جوڑے اب بھی رقص کناں تھے۔ جوانوں کا ٹولہ اپنی الگ ہی دُھن میں تھا۔ نئے زمانے کی بہت سی باتیں۔۔۔ فیشن، ٹی۔وی میڈیا، کیریئر، لٹریچر اور دیگر فائن آرٹس پر گفتگو، اور بیچ بیچ میں فلمی ستاروں کا تذکرہ، ان کی نقل۔ مگر سب کچھ شائستہ شائستہ۔۔ اسی درمیان روپی نے غور کیا۔۔ ایک بیرا اُن کی طرف خاص توجہ دے رہا ہے۔ ہر دس پندرہ منٹ میں مختلف ڈرنکس اور اسنیکس کی ٹرے لئے چلا آتا ہے۔۔۔ اور بڑے مسکرا مسکرا کر خدمت گزاری میں لگا ہے۔۔ کسی دوسرے کو پھٹکنے تک نہیں دے رہا۔۔ جب تک اُس کے والدین پارٹی میں تھے، اُن کی بھی اسی طرح خاطر داری میں لگا تھا۔۔ پانچ چھ گھنٹوں میں کسی کی بھی شکل وصورت بآسانی پہچانی جاسکتی ہے۔۔ اور پھر اس طرح خصوصی توجہ پر تو نظر جلدی جاتی ہے۔۔ روپی بار بار سوچتی، لیکن کچھ لمحوں کے لئے، کہ پھر کوئی نہ کوئی شُغل ان دوستوں کے درمیان چلنے لگتا اور اُس کا دھیان بنٹ جاتا۔۔۔ لیکن پھر بھی وہ بدستور اُس بیرے پر نظر رکھے ہوئے تھی۔۔۔ کہ اتنے میں آدھا گھنٹہ گزر گیا۔۔ نہ تو وہ ہی ٹرے لے کر آیا نہ کوئی دوسرا۔۔۔ اُس نے کچھ دیر کے لئے دوستوں سے معذرت چاہی اور رسوئی کی جانب بڑھ گئی۔۔ پاس جا کر ٹھٹھکی۔۔ اُس کی سماعت سے چند آوازیں ٹکرائیں۔۔۔ بڑی سرگوشی کے عالم میں وہ محوِ گفتگو تھے۔۔۔

''بھوپتی۔۔ بڑا کھیال رکھ رہا ہے۔۔۔ میموں کا۔۔۔ کیا اس بنگلے میں نوکری کا ارادہ ہے۔؟''

''نا رے نا۔۔۔ یہ سب دیش نوک کے ہیں۔۔ میں انہیں پہچان گیا۔۔ جاتا رہتا ہوں نا۔۔ وہاں۔۔''

''اچھا اُس اپنے یار۔۔۔ کیا نام ہے اُس کا۔۔''

''بھیلو رانا۔۔ ہاں۔۔۔ اُس کے گاؤں کے ہیں''

''ہاں۔۔۔ اُس گاؤں کے لوگ تو بھیا بڑے سیدھے سادے ہوتے ہیں۔۔ دیکھ لو۔۔ پنڈت جی

بکتی جلدی پارٹی سے چلے گئے۔۔۔یہ گھر شاید ان کی بہن کا ہے۔۔اور یہ لڑکی اُن کی بھانجی۔۔''
''بھانجی کو کیسے جانتا ہے؟''
''اَنومان سے کہہ رہا ہوں''۔بھوپتی نے سرگوشی سے ادھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا ہی تھا کہ اُس کی نظر روپی پر پڑی۔۔روپی نے بھی دیکھ لیا تھا، لیکن وہ اس طرح کا مظاہرہ کرنے لگی جیسے وہ اتفاقاً اُدھر آ گئی ہو۔اُسے کچھ تشویش تو ہوئی کہ یہ جان پہچان والا کہاں سے نکل آیا۔۔لیکن چونکہ دوستوں کے کھانا کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔۔وہ اُسی تذبذب میں وہاں سے پلٹ آئی۔

فائیو اسٹار ہوٹل میں بیرے کا کام کرتے بھوپتی کو چھ سات سال سے زیادہ ہی ہو گئے تھے۔اُس نے ابھی تک گھر نہیں بسایا تھا۔ایک مرتبہ کسی ٹورسٹ کی زبانی اس نے دیش نوک کے متعلق سن لیا تھا۔۔بس اُسے بھی اس عجیب وغریب مندر کے درشن کرنے کی ذھن لگ گئی۔اور دیوی کے درشن کے ساتھ اُسے ملی بھیلورانا کی دوستی۔اُسی دوستی اور عقیدت کے نشے میں وہ دو تین بار دیش نوک جا چکا تھا۔اپنی تعطیلات وہاں بتاتا۔اس لئے کچھ کچھ قصبے کے باشندوں کو بھی جاننے پہچاننے لگا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ آج راج کنور کے یہاں پارٹی میں اُس نے پنڈت رتن سنگھ کو پہچان لیا تھا۔اور اس لئے وہ خاص خدمتگاری میں لگا ہوا تھا۔بڑے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑی خبریں بن کر چرچا میں آ جاتی ہیں۔۔یہی حال اس پارٹی کا بھی رہا۔ہوٹل میں خصوصاً بیروں کے درمیان پارٹی کے اہتمام کے متعلق خوب باتیں ہوئیں۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر بھائی کو کچھ خاموش سا دیکھ کر راج کنور نے کُرید کی۔''بھئی سا! دیکھا آپ نے۔۔ہماری بنّو نے کس تیزی سے اپنی کامیابی کا لوہا منوایا ہے۔۔رات سبھی تعریف کر رہے تھے۔وہ چائے کی چُسکیاں لیتی جا رہی تھیں اور کہتی جا رہی تھیں۔اور ساتھ ہی ان کی نظریں بدستور بھائی کے چہرے کے تاثرات کا تعاقب کر رہی تھیں۔۔ایک ہی خون تھا۔۔اس

''اب چار سال میں روپی ڈاکٹر بن جائے گی۔۔دیش نوک میں جب لوگوں کی سیوا کرے گی، تب مجھے یقین ہے، اُن کی سوچ میں ضرور بہ بورتن آئے گا''۔

''اور اُس سے پہلے ہی کچھ ہوگیا تو؟''۔۔رتن سنگھ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا ہوگا۔۔جب تک آپ کی بہن زندہ ہے، کچھ نہیں ہوگا۔۔میں روپی کو ڈاکٹر بنوا کر ہی رہوں گی۔۔اب جب کہ اُس نے نئی زندگی میں قدم رکھا ہے۔۔آپ اُلٹا سیدھا نہ سوچیں۔۔بڑی مشکل سے اُس نے اپنے بھوت کال سے پیچھا چھڑ ایا ہے۔گھنٹوں سمجھایا ہے میں نے اُسے''۔

''میں بھی انہیں رات سے سمجھا سمجھا کر تھک گئی۔اب اس کا یہی علاج ہے کہ ہم آج ہی روانہ ہو جائیں، ورنہ یہ فضول کی چنتاؤں میں گھرے رہیں گے۔''سمھد را نے بیچ میں مداخلت کی۔

''ہاں یہی ٹھیک رہے گا۔۔۔چاہتی تھی کہ دو تین دن ٹھہرتے لیکن یہ اُچت نہیں ہوگا۔روپی کی موجودگی، آپ کو سوالوں کے گھیرے میں قید رکھے گی۔۔میں ابھی شام کی گاڑی کے ٹکٹ منگوائے دیتی ہوں۔۔دیو تو ابھی سو رہے ہیں۔۔رات بہت تھک گئے تھے۔روپی بھی سویرے جلد اٹھ کر پڑھائی میں لگی ہے۔آپ آج ہی نکل جائیں''۔۔راج کنور نے بھائی بھاوج سے کہہ تو دیا۔لیکن انہیں خود یہ اچھا نہیں لگا۔۔رتن سنگھ بھی اس عجلت میں پوشیدہ بات کی گہرائی کو سمجھ رہے تھے۔۔۔دونوں بہن بھائی، ایک دوسرے کی فطرت سے واقف تھے۔ان تنے باہمی تضاد سے بچنے کے لئے دور جانا ہی مناسب سمجھا۔۔پھر راج کنور نے یہی سوچا کہ'' جب تک یہاں رہیں گے۔۔روز بحث ہوگی۔۔روپی پر غلط اثر پڑے گا۔پھر پڑھائی میں خلل الگ ہوگا''۔۔بس چند لمحوں میں یہ سب سوچ کر انہوں نے جانے کی صلاح دے دی اور ٹکٹ بھی منگوا دیئے۔۔دیوندر سنگھ نے انہیں بہت روکا، مگر بہن بھائی نے بڑے خوبصورت بیانوں سے اُنہیں بہلا دیا۔روپی تو والدین کا یوں اچانک جانے کا سُن کر بکّی بکّی رہ گئی۔۔باپ کے سامنے تو کچھ نہیں بولی، کیونکہ رات سے ہی وہ ان کے چہرے کے تاثرات کا بخوبی اندازہ لگا رہی تھی۔۔ہاں ماں کو اشارے سے اپنے کمرے

میں بُلا کر پوچھنے لگی۔۔

"کیا بات ہے ماں۔۔اتنی جلدی آپ لوگ جا رہے ہیں۔۔۔پتا جی بھی، رات سے کچھ خوش نہیں ہیں۔کیا مجھ سے کوئی بھوُل ہوئی ہے"۔

"نا۔۔نا۔۔بنو! ایسا نہیں سوچتے، میری بچّی۔۔بس تو، تو جانتی ہے، انہیں وہاں ڈھیروں کام رہتے ہیں۔۔اس اُدھیڑ بن میں ہیں کہ کام بہت ہے چلو۔۔اب چلو۔۔پھر تیری خوشی تو ہو ہی گئی۔۔تُو بھی کتابوں میں گھسی رہتی ہے۔۔اس لئے ہم نے سوچا شام کو ہی روانہ ہو جائیں۔۔میری بچّی"۔۔انہوں نے اُس کی پیشانی چوُمی۔۔بھلا تجھ سے کیا بھوُل ہوگی۔۔۔بھوُل تو ہم بڑوں سے ہوگئی تھی"۔اُن کے لہجے میں ندامت کا پُٹ تھا۔

"ماں، تم مجھے جھوُٹی تسلی تو نہیں دے رہیں۔کہیں کوئی خطرہ تو نہیں، کیا کسی نے قصبے میں شکایت"۔۔روپی کے ذہن میں رات والے بیُرے کا سراپا گھوم گیا۔

"نہیں نہیں، روپی۔ایسا کچھ نہیں۔۔اور بھگوان نے چاہا تو، ہوگا بھی نہیں۔تو چنتا نہ کر اور ایسے ہی من لگا کر پڑھائی کرتی رہ"۔سبھدرا نے بیٹی کو گلے لگا لیا۔

"ماں۔۔۔بس مجھے شکتی دو۔۔۔تین چار سال چُٹکیوں میں نکل جائیں گے۔۔پھر دیکھنا، جب تمہاری بیٹی اپنے قصبے کے نواسیوں کا علاج کرے گی تو سب نت مستک ہو جائیں گے"۔روپی کا گلا رُندھ گیا تھا۔سبھدرا نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔۔اور پیکنگ کے لئے جانے لگیں تو۔۔۔روپی نے انہیں بڑھ کر دروازہ پر ایک بار پھر روکا۔۔

"ماں۔۔۔ں"۔وہ ٹھٹھکیں، مُڑ کر دیکھا، تو روپی بے ساختہ دوڑ کر اُن کے گلے لگ گئی۔۔اور نہ جانے کیوں زارو قطار رونے لگی۔سبھدرا کے بھی آنسو آ گئے، لیکن انہوں نے چھلکنے نہیں دیئے۔۔بس بیٹی کو چپنا کر ممتا سے سیراب کرتی رہیں۔اور رونے دیا، جتنا وہ رونا چاہتی تھی۔بس یہی سمجھاتی رہیں کہ:

"بنو، تو کسی بات کی چنتا نہ کر۔۔میں وہاں کے حال تجھے چٹھی میں لکھ دیا کروں گی۔۔بس تو، اپنی

بُواسا کا سپنا سا کار کرنے میں لگی رہ۔۔ شاباش، میری بہادُر بٹیا''۔ انہوں نے روپی کو اپنے آپ سے الگ کیا۔۔۔ آنچل سے اُس کے آنسو پونچھے۔۔''اب ہنس بھی دو بٹو۔ ورنہ ماں، ناراض ہو جائیں گی۔ ہنس دو۔۔۔ ہنسو۔۔۔ وہ آئی ہنسی۔۔ وہ آ گئی۔۔ ایں۔۔ ایں۔۔'' یہ کہتے کہتے دونوں ماں بیٹی مسکرائیں پھر ہنسنے لگیں۔

''شاباش۔۔ بہادر بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بالکل کرنی ماتا کی طرح۔۔ سُشکت۔۔ سکشم۔۔'' انہوں نے روپی کے دونوں بازوؤں کو زور سے تھام کر دبایا۔ اس ہلکی پھلکی فضا کے بعد وہ سامان جمانے اپنے کمرہ کی جانب چلی گئیں۔ روپی کے لئے نوکر دودھ کا گلاس لے آیا تھا۔ ٹھنڈا دودھ۔۔ وہ صبح صبح فریج کا ٹھنڈا دودھ ہی پیتی تھی۔

آج اُس کا دِل چاہا۔۔۔ سڑک۔۔ سڑپ کر کر کے دودھ کی گھونٹیں بھرے۔۔۔ اور دوسرے ہی پل اُس نے ایسا کرنا بھی شروع کر دیا۔ مسکراتی جاتی تھی اور سڑا کے بھرتی جاتی تھی۔

(باب۔۱۲)

تین دن سے مُسلسَل ایک نہ ٹوٹنے والی لڑی کی طرح آسمان سے دھوُل کے بادل برس رہے تھے۔ ہر طرف غبار ہی غبار۔۔ ریت ہی ریت۔۔۔ کھانے میں، پینے میں، کپڑوں میں، سر میں۔۔ پسینے سے شرابور جسم پر بھی ایسی چپٹتی کہ پورا وجود ہی کرکرا، کھر درا چپ چپا محسوس ہونے لگتا۔ تپتے سورج نے زندگی کی سختی میں اور اضافہ کردیا تھا۔ دوپہر ہوتے ہوتے قصبہ میں سناٹا چھانے لگتا اور ذرا سی دیر میں شائیں شائیں لُو چلنے لگتی۔۔ آج حویلی میں بھی صبح سے ہی سناٹا تھا۔۔ ساری زنانیاں پڑوس کی حویلی میں کسی کی میت میں شریک ہونے گئی ہوئی تھیں۔ پنڈت رتن سنگھ بھی رات سے وہیں تھے۔ تمام رات کریا کرم کانڈ، پوجا ارچنا چلتی رہی تھی۔ بہت تھک گئے تھے۔ بس نبٹا کر ابھی حویلی میں قدم رکھا ہی تھا۔ تنِک وِشرام کیا جائے کی طرز پر سیدھے سھدرا کے کمرے کی سیڑھیاں چڑھ کر پہنچ گئے۔ نہا دھوکر اوسان ٹھیک کئے۔ بٹن دبایا تو لائٹ آ رہی تھی۔ فَر فَر پنکھا چلنے لگا۔ اپنے آپ کو سفید چادر بچھے بستر کے حوالے کردیا۔۔ کہ اتنے میں گلا سوکھتا محسوس ہوا۔ ہاتھ بڑھا کر صراحی اُٹھائی اور گلاس میں پانی انڈیلا۔۔ صراحی خالی تھی۔۔۔ ہمت نہیں تھی کہ نیچے سے پانی بھر کر لاتے۔ یونہی آواز لگادی۔ حالانکہ دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ سامنے دروازے سے اترتے زینے سے سیدھے صحن تک نظر پہنچتی تھی۔

''ارے کوئی ہے۔۔ ذرا پانی پلانا''۔۔۔ اتفاق سے زینے کے پاس سے روَنی گزر رہی تھی۔ آواز سن کر ٹھٹھک گئی۔'' جاؤں کہ نہ جاؤں۔۔ چل کے دیکھوں تو کہ بڑے پنڈت جی سا کو کیں پریسانی ہے''۔ روَنی دل ہی دل میں یہ سوچ گئی۔ آخرِ کار گول پنڈلیاں زینہ چڑھنے لگیں۔

''کیں بات ہے سرکار سا''۔۔ اُس نے گھونگھٹ کو اور لمبا کرلیا۔ اور جسم کو سمیٹتے ہوئے بے حد

جھجھک کر پوچھا۔۔بڑے پنڈت نے پہلی بار روپی کی آواز سنی تھی۔کھنکھناتی ہوئی جوان آواز۔۔وہ بھی گھبرا گئے۔۔لیکن پھر سنبھل کر بولے۔۔

''تنِک جل بھرلا۔۔صراحی خالی ہے''۔۔

جو حکم سا''! کہتے ہوئے روپی مسہری کے پاس رکھی میز پر صراحی اٹھا کر لے گئی۔اور چھوڑ گئی اپنے جسم کی کھٹی میٹھی خوشبو۔وہ خوشبو جو ہوا کے دوش پر سوار ہو کر جہاں سے چاہتی ہے گزر جاتی ہے۔۔جس پر کبھی کوئی قدغن نہ لگا سکا۔۔بالکل اس طرح، جس طرح، انسان کے جمالیاتی حس پر کوئی پہرہ نہ بٹھا سکا۔رتن سنگھ کا وجود اس خوشبو سے معطر ہو اُٹھا۔وہ تخیل میں روپی کے ساتھ اُڑنے ہی والے تھے کہ بڑی رنگین حقیقت سے اُن کا سامنا ہوا۔

''پانڑ۔س پیّو سا''روپی اپنے کٹیلے سراپے کے ساتھ گلاس ہاتھ میں تھامے سامنے کھڑی تھی۔گھونگھٹ نے اور غضب ڈھا رکھا تھا۔''آخر اس گھونگھٹ میں ہے۔۔کے۔۔سا۔۔چہر۔۔آ۔۔ا''انہوں نے پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے، جیسے ہی روپی کے ہاتھ سے گلاس لیا۔اپنے اندر کا تمام نظام انہیں درہم برہم ہوتا محسوس ہوا۔سانسیں تھیں کہ بھق بھق منھ اور ناک سے نکلے چلی جا رہی تھیں۔۔غٹ۔۔غٹ۔۔غٹ۔۔ایک سانسیں میں انہوں نے گلاس خالی کر کے روپی کے آگے دوبارہ بڑھا دیا۔روپی اپنے مالک کی کیفیت بڑے رس بھرے انداز سے دیکھ سمجھ رہی تھی۔اور دل ہی دل میں لطف بھی لے رہی تھی۔اُسے شرارت سوُجھی۔۔گلاس ہاتھ میں لے کر وہ کچھ اس طرح کسمسائی کہ آنچل سر سے ڈھلکا۔۔۔ڈھلکا۔۔اور ڈھلک کر چھاتی تک آ گیا۔۔اور پھر ڈھلکتا ہی چلا گیا۔اسی کے ساتھ پنڈت کی نظریں بھی ڈھلکنے لگیں۔۔اور پھر جون کی بھری دوپہر میں شبنمی ٹھنڈک کا احساس حد سے تجاوز کرتا چلا گیا۔۔پنڈت جی کے ہاتھ میں ایک دوبار جنیو اُلجھی۔۔تو انہوں نے جھنجھلا کر اُسے اُتار پھینکا۔۔۔اور۔۔۔کب کتنا وقت گزر گیا، انہیں پتہ ہی نہیں چل سکا۔ہوش تب آیا جب کسی نے ان کے پاؤں کے انگوٹھے کو زور سے پکڑ کر نیند سے جگایا۔آنکھ کھولی تو دل دھک سے رہ گیا۔۔پائینتی کھڑی تھیں۔۔۔سبھدرا رانی۔۔ان کی شریک

حیات۔۔۔ درمیانہ قد، ہلکے بادامی رنگ پر کتھئی رنگ کے باڈر والی سیدھے پلّے کی ساڑی میں ملبوس، سر پہ آنچل، کشادہ پیشانی پر بڑی سی لال بندی، مانگ سندور سے بھری بھری، ہاتھ چوڑیوں سے لدے لدے ہونٹوں پر خاموشی، چہرے پر سختی اور آنکھوں میں خاص شرارے لئے، لاتعداد سوالات کا مجسمہ بنی۔

رتن سنگھ ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھے۔اور ساتھ ہی روئی بھی۔دونوں کے کاٹو تو خون نہیں۔۔ والی کیفیت تھی۔ روئی نے ہڑبڑاہٹ میں اپنی لوگڑی[1] کو جیسے تیسے بدن پر لپیٹا، دونوں ہاتھ جوڑ، گڑگڑاتی، گھگھیاتی، مسہری سے نیچے اُتر۔ کمرہ سے بھاگتی ہوئی اس قدر جلدی زینہ اُتری کہ تین چار پھلانگوں میں صحن میں پہنچ گئی۔اب رہ گئے رتن سنگھ۔ان سے تو کچھ کہتے ہی نہ بن پڑا۔۔زبان گنگ، آنکھیں پھٹی اور چہرے پر ہوائیاں۔۔ سبھدرا کے خاموش مگر پتھریلے چہرے اور اپنی حرکت و حالت کا احساس کر کے تو اُن کا لہو جیسے جم گیا۔۔چند منٹ تک وہ بے سکت رہے۔لیکن پھر کچھ بولنا چاہا۔۔۔ نہ جانے کیا۔آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔ کہ اتنے میں سبھدرا رانی نے آگے بڑھ کر تاڑ، تاڑ دو تھپڑ اُن کے گل پر جڑ دیئے۔۔اور انگلی کے اشارے سے دروازہ کا راستہ دکھایا۔

رتن سنگھ پٹ کر بھی ڈھیلے بنے ہوئے تھے۔ بس۔ ''یہ سب کیا ہو گیا۔۔ کے۔۔ سے۔۔ہو۔۔گ۔۔ یا۔۔'' مسلسل یہی بڑبڑا رہے تھے کہ ناگہاں ان کی نظر مسہری کے نیچے پڑی اپنی جنیو پر جا کر ٹھہر گئی۔۔ ''اُف۔۔ یہ کے۔۔۔ سے۔۔ کہتے کہتے انہوں نے اُسے اٹھا کر دھارن کیا۔ کھڑے ہو، دھوتی کو کھینچ کیا اور بیوی کی طرف اس ندامت سے دیکھا کہ گویا کہہ رہے ہوں۔ ''میں تمہارا مجرم ہوں۔۔دے لو جو سزا دینا چاہو۔۔ حاضر ہوں۔۔'' لیکن سبھدرا نے ان کی طرف سے منھ کا رُخ دوسری جانب پھیرتے ہوئے اُسی خاموشی سے پھر انگلی سے باہر کا راستہ دکھایا۔ رتن سنگھ نے دیکھا ان کے ہاتھ کی رگیں تنی ہوئی ہیں۔ وہ چپ چاپ، ننگے پیر ہی نڈھال قدموں سے باہر نکل گئے۔

ا۔ساڑھے تین میٹر کی ساڑی۔

سبھدرا نے حقارت سے مسہری کو دیکھا۔ سلوٹوں بھری چادر اُن کا منھ چڑا رہی تھی۔ اُن کا دل چاہا۔۔ اس مسہری کو الٹ دیں۔ ہتھوڑا لا کر چور چور کر دیں۔۔ مانگ کا سندور پونچھ دیں۔ ماتھے کی بندیا مٹا دیں۔۔ بھری چوڑیاں توڑ دیں۔۔ ہر اُس نشانی کو مٹا دیں۔۔ جو سہاگ کی گواہی دے رہی ہو۔

لیکن انہوں نے صرف اتنا کیا کہ آرام کرسی پر بیٹھ کر بھینچے بلاؤز کے نیچے کے دو ہُک کھولے، کمر کی سائڈ سے ساڑی نکال، کمر بند کو ڈھیلا کیا۔ اور اعضا مضمحل کر، کُرسی کی پُشت پر ٹیک لگا، ادھ لیٹی حالت میں اپنے آپ کو ڈھال کر آنکھیں بند کرلیں۔۔ کبھی تو وہ کُرسی زور زور سے ہلانے لگتیں، کبھی دھیرے دھیرے۔۔ اور اچانک روک کر۔۔ چھت کی طرف گھورنے لگتیں۔۔۔ آخر انہوں نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے ساکت ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔۔۔ لیکن پھر منٹ بھر بعد اٹھیں اور غسل خانے کا دروازہ کھول، اندر گھُس گئیں۔۔ دوسرے ہی پل وہ مع کپڑوں۔۔ پانی کے کُنڈ؎ میں تھیں۔

پورے چار مہینے گزر گئے تھے۔ انہوں نے اپنے شوہر سے بات تک نہیں کی تھی۔ اس درمیان رتن سنگھ نے اپنی جانب میں کئی مرتبہ کوشش کی کہ کچھ صفائی دیں، لیکن سبھدرا رانی تو اُن سے بالکل لاتعلق سی ہوگئیں تھیں۔ ان کی اس خاموشی نے رتن سنگھ کے پچھتاوے میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ روپی بھی مالکن کے اس روپ کو دیکھ کر دل ہی دل میں اُس منحوس گھڑی کو کوستی۔۔ اپنے آپ کو گالیاں دیتی۔۔ بال نوچ لیتی۔۔۔ ایک دن اس کی یہ کیفیت دھوبی نے دیکھ لی۔۔ ماجرا جاننا چاہا۔۔ پہلے تو روپی ٹالتی رہی، بہانے بنائے، لیکن دھوبی کی ہمدردی نے اسے پگھلا دیا۔۔ سب کچھ اُگل دیا۔۔ اور یہ بھی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ دھوبی کے تو جیسے پیروں تلے زمین کھسک گئی ہو۔

"تو یہ کیا کر بیٹی۔ رانڈ۔۔۔ پالنے والے گھر کو ہی ڈس لیا۔ تو مر کیوں نہیں گئی۔۔ باوڑی میں

۱۔ پتھر کی بنی ٹب۔ حوض

جا کر ڈوب مرتی۔۔چھنال۔۔" یہ کہتے کہتے اس نے لاتوں گھونسوں سے روپّی کو مارنا شروع کر دیا۔ دھوپّی تو جیسے پاگل ہوگئی تھی۔مگر روپّی بھی خاموش پٹتی رہی۔آخر جب دونوں تھک گئیں تو سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔انہیں تاریکی و بربادی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

حالات کے اس بھنور میں ایک دن کام کرتے کرتے روپّی کو اُبکائی آئی۔۔اور صحن کی نالی میں اُس کا منہ کھل گیا۔

"ہے بھگوان! یہ کیسا اَشُبھ سنکیت ہوا"۔دادی تو جیسے فکروں کا محور بن گئیں۔

"ارے کس کا ہے۔۔کہاں منہ کالا کیا ہے"۔۔دادی نے دو گھونسے اس کی کمر پر جمائے۔ایک اُلٹی اور ہوگئی۔۔سمھدرا شور سُن کر دوڑیں۔۔آکر دیکھا تو انہیں سمجھتے دیر نہ لگی۔لگتی بھی کیسے۔۔۔ ٹھنڈا سانس بھر کر بس اتنا کہہ سکیں۔۔

"سائو ماں! اسے یوں نہ مارو۔۔مجھے سب معلوم ہے"۔

"کیا۔؟؟ دادی کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

"بہو، بتاؤ کون ہے وہ۔۔اُس حرام کے پلّے سے ہم اپنی حویلی اَپوتر ہونے نہیں دیں گے"۔۔وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ، آدھی ادھوری کمر لئے، جتنا تن سکتی تھیں، اُتنا تن کر کھڑی ہوگئیں۔اتنے میں منجھلی بہو بھی وہاں آگئی۔وہ بھی روپّی کو حقارت سے دیکھنے لگی۔روپّی استغراق پر استغراق کئے چلی جا رہی تھی۔۔دھوپّی بھی آگئی، مگر دور ایک کنارے کھڑی، بہن کی ذلت اور آگے ہونے والے حشر کا اندازہ لگا۔وہ خالی خالی آنکھوں سے دیکھنے کو مجبور تھی۔

دادی نے تو جیسے چنڈی کا روپ دھار لیا تھا۔روپّی کو چھوڑ سمھدرا کے پیچھے پڑ گئیں۔

"بتاؤ بہو۔کون حرامزادہ ہے وہ"۔لیکن سمھدرا کو مسلسل خاموش اور گہری سوچ میں مبتلا دیکھ کر اُن کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے۔۔کہیں رتن۔۔نہیں۔۔۔اے بھگوان۔۔اے کرنی ماتا۔۔ ہماری لاج تمہارے ہاتھ ہے"۔۔۔وہ شک کے دائروں میں گھرتی چلی گئیں۔پَل بھر میں غصہ غم کے اندھیروں میں قید ہو کر بے آواز ہوگیا۔تجربے نے دل تھامنے پر مجبور کر دیا۔بس کھڑا ہی نہیں

ہوا گیا، اُن سے ۔۔ وہیں صحن میں بچھے تخت پر بیٹھ گئیں۔ طبیعت بگڑنے لگی۔ سہدرا نے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ اور جیسے تیسے ان کے کمرے میں پہنچاتے ہوئے دھوتی کو اشارہ کرتی گئیں کہ وہ بہن کو سنبھالے۔ منجھلی بہو رینو بھی یہ سب دیکھ سمجھ کر بڑی تشویش میں گرفتار تھی کہ آخر وہ کون ہے۔۔؟۔۔ ایک ایک کر، اُس کے تصور میں گھر کے تمام مردوں کی شبیہہ ۔۔ گھومتی چلی گئی۔ لیکن سہدرا نے ماحول کا رُخ ایسا موڑا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔۔ یا جو کچھ ہوا ہو، اس کے لئے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہ ہو۔۔ متوازن لہجے میں ساس سے اس طرح مخاطب ہوئیں۔

''سائیو ماں! آپ دھیرج رکھیں۔ ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ معلوم کریں گے۔ لیکن بہت ساوٗدھانی سے۔ حویلی کے رُتبے کی بات ہے''۔ چلو بہو۔ کھانے میں دیر ہو جائے گی۔۔ جلدی سے رَسوئی نبٹالیں''۔ سہدرا یہ کہتے ہوئے رینو کو ساتھ لے باورچی خانہ کی طرف ایسے بڑھ گئیں جیسے سب کچھ معمول کے مطابق ہی ہو۔

طوفان سے پہلے ہونے والے سناٹے نے حویلی کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ لیکن رینو سے رہا نہیں گیا۔ سبزی بگھارتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔

''جی جی سا! اس کو نکال باہر کیوں نہیں کرتیں۔ کل موہی۔ جانے کس کا پاپ لئے پھر رہی ہے۔ حویلی کی پوترتا کو گرہن لگا رہی ہے، جنم جلی''۔ حقارت سے اُس کا منھ بگڑتا چلا گیا۔

''سمے کی دھارا کو سمجھو بہو۔۔ یوں شور مچانے سے ہماری ہی بدنامی ہوگی۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

''کیا ٹھیک ہو جائے گا، جی جی۔۔ اس نے بات کاٹی۔ کیا اس حرام کو جنواؤ گی۔ اُسے تو مار کر گڑوا دینا چاہئے زمین میں چُپ چاپ۔

سہدرا رانی کو اس کے جملوں سے ٹھیس پہنچی۔ جس کا باپ اس حویلی کا کرتا دھرتا تھا، اُس کی اولاد کو محض سات پھیرے نہ لینے کی وجہ سے حرامیوں پر پُکارا جا رہا تھا۔

''کیسی وِڈمبنا ہے یہ بھگوان۔۔ انہوں نے دل ہی دل میں سوچ کر گہری سانس لی۔ ساتھ ہی

دیورانی کے کندھے کو دباتے ہوئے اس کے غصّے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

رتن سنگھ نے اب زنان خانے میں آنا بہت کم کر دیا تھا۔ ندامت کی وجہ سے اب اُن میں بیوی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اگر کچھ کہہ لیتے تو شاید دل ہلکا ہو جاتا، لیکن بیوی کی خاموشی نے تو دل پھاڑ رکھا تھا۔ لیکن آج سھدرارانی نے دیور کے ذریعے اُن سے کہلوایا کہ" کچھ خاص بات کرنا ہے، شام کو کمرے پر آنا"۔ سدرشن سنگھ کو تو پہلے ہی علم ہو چکا تھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ رینو نے بتا دیا تھا۔ وہ بھی فکرمندی کے عالم میں تھے کہ آخر یہ کیا کس نے؟ کس بیچ یہ کہاں نکل گئی؟"۔

رتن سنگھ نے بیوی کا پیغام سنا تو ان کے تو جیسے پھیپھڑے پچک گئے۔ سانس اوپر کی اوپر، نیچے کی رہ گئی۔ نہ جانے کیا بات ہوگی۔۔ کیا کہیں گی۔۔ کہیں طلاق۔۔ نہیں۔۔ پھر؟۔۔۔ کہیں روپی پیٹ سے تو۔۔۔؟ نہیں۔۔ کہیں روپی کا بھید تو نہیں کھل۔۔۔ نہیں نہیں، نہیں۔۔ کچھ نہیں ہوگا۔ وہ تو میری یاد آئی ہوگی۔ بات کرنا چاہتی ہوں گی مجھ سے آخر کتنے دن ہو گئے، کتنا پریم کرتی تھیں مجھ سے۔۔۔ ہر بات میں، ہر فیصلے میں میری رضامندی بغیر ایک قدم نہیں بڑھاتی تھیں۔۔۔ بس۔۔ اب مجھ سے بات کئے بغیر نہیں رہا جا رہا ہوگا۔ اسی لئے۔۔" انہوں نے اپنے آپ کو کسی طرح مطمئن کر لیا۔ دن، بڑی اضطرابی میں گزرا۔ ڈر بھی لگ رہا تھا اور پیار بھی اُمڑ رہا تھا۔

"میں تو اپنا سر اُس دیوی کے چرنوں میں رکھ کر معافی مانگ لوں گا۔۔ رگڑتا رہوں گا اپنی اپنی ناک۔۔ جب تک معاف نہیں کریں گی"۔ آج دن بھر کسی کام میں اُن کا دل نہیں لگا۔ جیسے تیسے شام ہوئی تو زنانے کا رُخ کیا۔ چوروں کی طرح حویلی میں گھسے۔۔۔ اِدھر اُدھر چوکنا نظروں سے دیکھتے رہے کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔۔ کہیں روپی سے تو سامنا نہیں ہو جائے گا۔ کمرے تک پہنچتے پہنچتے دو تین ٹھوکریں بھی کھا گئے۔ اپنی ہی شریکِ حیات کے سامنے جاتے ہوئے، اس بارعب شخصیت کے، آج پاؤں کانپ رہے تھے۔

رات کے آٹھ بجے تھے۔ کمرہ میں خلافِ معمول زیرو واٹ کا سُرخ بلب جل رہا تھا۔ مدّھم روشنی میں، آرام کرسی پر، مسہری کی طرف پشت کئے سہد را رانی بیٹھی تھیں۔ آج بھی انہیں شوہر کی شکل دیکھنا گوارا نہیں تھا۔ مسہری پر تو انہوں نے اُسی دن سے لیٹنا، بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ زمین پر بستر بچھا کر سوتی تھیں۔۔ رتن سنگھ نے دبے پاؤں آ کر جالی کا کواڑ کھولا۔۔ اندر جھانکا۔۔ معائنہ کیا۔۔ دیکھا۔۔ پنڈتانی براجمان ہیں۔۔۔ دل نے کہا۔۔ ''ارے باپ رے باپ''۔۔ پھر دھیرے سے دروازہ بند کیا۔ اور چپکے چپکے پنجوں کے بل چل کر پشت سے بیوی کو بازوؤں میں بھرنے کے لئے جیسے ہی ہاتھ بڑھائے۔ boss کی طرح گرجدار آواز میں حکم ملا۔

''مجھے چھونے کی ہمت تک مت کرنا۔ چپ چاپ مسہری پر بیٹھ جائیے اور بات کی گمبھیرتا کو سمجھ کر، کوئی مناسب فیصلہ کیجئے''۔

''اور۔۔ پارہ اب تک ہائی ہے۔۔ پانسو واٹ کا بلب بنی ہوئی ہیں''۔ رتن سنگھ کو بیوی پر مسلسل پیار آئے جا رہا تھا۔ انہوں نے پھر جیسے تیسے ہمت بٹوری۔۔ اور پھر جھکے۔۔ کہ بجلی کی تیزی کے ساتھ سہد را اپنی جگہ سے اٹھیں اور آخری تنبیہہ والے انداز میں بپھریں۔۔ لیکن اب کی مرتبہ بپھرن کچھ پھُسپھُسی تھی۔ بس رتن سنگھ نے ان کی اس کمزوری کو بھانپ لیا، انہیں تقویت مل گئی۔ انہوں نے بیوی کے روبرو آ کر لائٹ جلائی اور تیز روشنی میں اُن کی آنکھوں میں ٹوٹ کر جھانکا اور انہیں پُراسرار نظروں کے ساتھ منھ سے نکلا۔

''اُف یہ داؤ۔۔ اور وہ بھی ہم پر۔۔'' لیکن ابھی سہد را کا غصہ برقرار تھا۔

''اگر گمبھیرتا سے بات کرنا ہے تو وہاں، مسہری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، چُپ چاپ بیٹھ جائیے، میرے پاس فالتو، باتوں کے لئے سے نہیں''۔ یہ کہہ کر وہ پھر کُرسی پر بیٹھ گئیں۔

''جو حکم سرکار کا۔۔ یہ لیجئے بیٹھ گئے''۔ انہوں نے بیٹھتے ہوئے بیوی کی کُرسی کے رُخ کو اپنی طرف، زبردستی موڑ لیا۔۔ ہلکی پھلکی تو تھیں ہی۔۔ کُرسی فوراً گھوم گئی۔ اُن کا بس ہی نہ چل سکا۔ اب روبرو آ ہی گئی تھیں تو نظریں دوسری طرف کر کے اُسی خفگی سے بولیں۔۔ حالات کی نزاکت سے بے خبر

رتن سنگھ مسلسل شوخ نظروں سے ایک ٹک بیوی کو دیکھے جا رہے تھے۔

''روتی کو چوتھا مہینہ چل رہا ہے''۔

''کیا۔؟رتن سنگھ کو جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔۔

''ہاں۔۔وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے'' یہ کہتے ہوئے سھدرا کو لگا کہ یہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائے۔لیکن سوائے خون کا گھونٹ پی کر رہ جانے کے،اور کوئی چارہ نہ تھا۔

'ک۔ک۔ک۔یا۔یہ کیسے ہوسکتا ہے''۔بوکھلاہٹ میں وہ ہکلانے لگے۔

''جو کیا ہے،اُسے بھرو بھگتو۔۔میں کیا جانوں۔۔'سھدرا نے تمسخرانہ انداز میں جملہ پھینکا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔''اچانک رتن سنگھ کا چہرہ سخت ہوتا چلا گیا۔''گروادو،بچہ''

''مجھے معلوم تھا آپ یہی کہیں گے''۔لیکن اب میں کہتی ہوں اور سنیئے۔۔

''بچہ اس سنسار میں جنم لے کر رہے گا''۔

''تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہی ہو''۔رتن سنگھ نے حیرت واستعجاب سے کہا۔

''اچھی طرح''۔۔بڑے اطمینان سے انہوں نے جواب دیا۔

''لوک لاج،میری عزت،حویلی کی مریادا''۔

''کس لوک لاج،کس عزت،کس مریادا کی بات کر رہے ہیں پنڈت جی''انہوں نے بات کاٹتے ہوئے برسنا شروع کیا۔۔۔'یہ سب کہنے کے آپ ادھیکاری نہیں رہے،اُس وقت کہاں گئی تھیں یہ سب باتیں جب یہ کانڈ کر رہے تھے''۔سھدرا کا گلا بھر گیا،لیکن بڑی ہمت سے وہ ضبط کر گئیں۔

رتن سنگھ کچھ نرم پڑ گئے،لیکن پھر انہوں نے اپنی بات دہرادی۔جس پر سھدرارانی کو شدید غصہ آگیا۔

''آپ نے تو زبان اٹھائی تالو سے ماردی۔۔بچہ گرادو۔کوئی مذاق ہے۔۔ماں کی جان کو خطرہ ہوتا ہے،اس میں۔''

''خطرہ۔۔۔!۔۔خطرے کا آبھاس تو مجھے ہو رہا ہے،تمہارے فیصلے پر،کیوں اُس دوکوڑی کی

استری پر تمہارا لاڈ ٹپک رہا ہے۔۔ مر جانے دو۔۔ دونوں کو۔

''واہ۔۔ پنڈت۔۔۔ بڑی آسانی سے کہہ گئے نہ یہ سب۔۔ مجھے معلوم تھا تمہارا جواب۔لیکن میں اپنے جیتے جی یہ انیائے کبھی نہیں ہونے دوں گی۔۔ نہ بچہ گرے گا۔۔ نہ ماں مرے گی۔۔ آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا''۔ سمدرا نے جج کی طرح فیصلہ سناتے ہوئے گویا عدالت ختم کردی۔۔ دروازے کا رُخ کیا۔ جانے کو تھیں کہ اُن سے قبل رتن سنگھ ایک جھٹکے کے ساتھ دروازے سے باہر یہ کہتے ہوئے نکلے کہ ''تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے، اب تک اس گھر میں وہی ہوا ہے، جو میں نے چاہا۔اور آگے بھی وہی ہوگا، جو میں چاہوں گا۔۔ استری جات ہو، زیادہ پیر پسارنے کی ضرورت نہیں''۔ یہ کہتے کہتے رتن سنگھ اپنی جھانجھ میں ایک ساتھ دو دو سیڑھیاں اُترتے ہوئے۔پَل میں نظر سے اُوجھل ہو گئے۔ سمدرا رانی دیکھتی ہی رہ گئیں۔انہیں اپنی اندرونی طاقت چٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دل بیٹھنے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ ریلنگ کی جالی پکڑ کر انہوں نے سہارا لیا۔ مگر رتن سنگھ کے آخری جملے نے ان کے دل کا کام تمام کر دیا تھا۔''استری جات ہو، زیادہ پیر پسارنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ ضرورت نہیں۔۔''ایک لمحہ میں انہیں اپنی اوقات کا علم کرا گیا یہ جملہ۔۔۔لیکن۔۔ ان نشتروں کو بھی انہوں نے برداشت کیا۔ وہیں، پانچ منٹ تک کھڑی رہیں۔ پھر زینہ اُتر کر ساس کے کمرہ کی جانب بڑے ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے بڑھ گئیں۔ دیورانی ٹوہ میں تو تھی ہی۔۔۔ کان لگے تھے اُس کے۔۔ زیادہ کچھ تو نہیں سُن سکی البتہ جیٹھ کی تیزی سے تھوڑا بہت اندازہ لگا سکی۔۔ پھر خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگی۔

''مجھ اُبھاگن کی کوئی سہیلی بھی تو نہیں ہے، جو میں اپنی بات کہہ کر دل ہلکا کرلوں۔ جٹھانی تو گھانس ہی نہیں ڈالتیں۔ پتی دیو سنتے نہیں، باہر جانے کا رواج ہے نہیں۔۔ اب رہیں۔۔۔ روئی دھوئی۔۔ ہونہہ۔۔ بھلا ان سے دوستی''۔۔ اس نے ناک بھوؤں چڑھائے، اتنے میں سمدرا کو ساس کی طرف جاتے ہوئے دیکھا، تو خود بھی آگے بڑھی، لیکن پھر ساس کا خیال آتے ہی پیچھے ہٹ گئی۔''ابھی دونوں یا تو بات چھپالیں گی یا بدل دیں گی۔۔ میں اپنا سا منہ لئے کھڑی رہوں

گی''۔۔یہ سوچ کر وہ وہیں کھڑی کھڑی حسرت سے ساس کے کمرہ کی جانب دیکھنے لگی۔

ماتیشوری نے اپنی بڑی بہو کو گہری سوچ، نڈھال قدموں سے آتے ہوئے دیکھا تو سنبھل کے بیٹھ گئیں۔۔معلوم تو تھا ہی، لیکن بیٹے سے کیا بات ہوئی، اس کی بے چینی تھی۔

''بیٹھو بہو!'' انہوں نے پلنگ پر اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔سہدرا خاموشی سے بیٹھ گئیں۔ٹھنڈا سانس بھرا، سر پہ پلّو کو درست کیا اور ساس کی سوالیہ نظروں کا جواب دینے کے لئے ہونٹ کھولے۔

''ساسو ماں! وہ کہتے ہیں۔۔بچہ گروا دو یا دونوں کو مروا ڈالو۔۔ماں، یہ بٹیا ہے، پاپ ہے۔بھلا یہ انیائے کیسے کریں۔۔'' اُس نے ساس کو اپنا حمایتی مانتے ہوئے تصدیق چاہنے والے انداز میں کچھ اس طرح کہا کہ گویا ساس اُس کی بات کی پیروی کریں گی۔

''بہو! رتن ٹھیک کہتا ہے۔۔بچہ جنمے گا تو رسوائی ہو جائے گی۔ہم کہیں کے نہیں رہیں گے''۔'' کچھ ایسا ہی ہو کہ دونوں کا معاملہ سُلٹ جائے۔۔مروانا ہی بہتر ہوگا''۔۔انہوں نے دور اندیشی والے انداز میں آنکھوں کو چُندھیا کر، پیشانی پر بل ڈال کر فیصلہ سُنایا۔

''ماں، آپ بھی۔۔۔''سہدرا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

''ہاں بہو میں بھی۔۔۔یہی اُچت ہوگا۔ارے ان گنواریوں کا کیا۔۔۔جیتی مرتی رہتی ہیں۔۔دھرتی کا بوجھ ہیں۔۔۔سنتولن کے لئے مرتیو، آوشک ہے کہ نہیں''۔۔انہوں نے دانشوری جتانا چاہی۔

''ماں! آپ ایک استری ہو کر۔۔۔استری کے دُکھ کا ہرن تو دُور، مانو کے ادھیکار پر بھی چوٹ کر رہی ہیں۔روپی ایک جیتا جاگتا پرانری ہے۔اُس میں دو دو جیون ٹھاٹیں مار رہے ہیں۔۔۔اُن کی بٹیا۔۔اور وہ بھی سوچ وِچار کر۔۔پلان کے تحت۔۔۔یہ مانو جاتی کا گھور اپمان ہے۔''سہدرا نے بگڑتے ہوئے دلیل دی۔

''تم کچھ بھی کہو، کچھ بھی سوچو۔۔۔یہ سب پوتھیوں کی باتیں ہیں۔۔۔یتھارتھ وہ ہے جو رتن کہتا

ہے۔اور ہونا بھی وہی چاہئے۔۔ہوگا بھی وہی۔۔۔اور اسے تمھیں چھپانا بھی پڑے گا۔اپنے تک سیمت رکھنا پڑے گا۔۔میں نے تمہارے سُسر سے بھی بات کر لی ہے۔ باپ بیٹے کی ایک ہی رائے ہے"۔۔سھدرا تو جیسے آسمان سے گری۔۔۔"ہے بھگوان، ہے ماتا میں کیسے درندوں سے گھری ہوں۔۔یہ پاپی ہیں۔۔۔ہتیارے ہیں۔انہیں سَدبُدّھی دے ماتا"۔۔

وہ تو رات بھر نہیں سوئیں۔۔نہ کھانا کھایا، ہ پانی پیا۔۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی رہیں۔۔۔کیا کروں۔۔۔نَنَدجی کو چٹھی لکھوں۔ پر وہ بھی تو دل کی مریض ہیں۔۔کہیں بھائی کے کرتُوتوں سے انہیں دوبارہ۔۔نہیں نہیں۔۔ پھر روپی بھی تو وہاں ہے۔۔اُسے پتہ چل گیا تو۔۔۔نہیں چٹھی تو نہیں لکھوں گی۔۔۔پھر کیا کروں؟۔۔پولس۔۔۔پر میں یہ سب کیسے"۔۔۔

وہ رات بھر چھٹپٹاتی رہیں۔اور پھر کئی راتیں، کئی دن تک چھٹپٹاتی رہیں۔۔۔ان دنوں انہوں نے روپی کا خیال رکھنا شروع کر دیا تھا، بلکہ اُس کی نگرانی کرنے لگیں تھیں۔اور روپی۔۔۔وہ تو ندامت اور شرمندگی سے گڑھی جاتی تھی۔سھدرا کے سلوک نے اُسے اور نت مستک کر دیا تھا۔۔۔ہر وقت اپنے آپ کو اور اُس گھڑی کو کوستی رہتی تھی۔ دھوپی بھی آئے دن اُسے بُرا بھلا کہتی، لیکن پھر اس حالت میں خیال بھی رکھتی۔کام بھی زیادہ تر خود ہی نبٹاتی۔۔اُسے اپنی گنوار بہن پر رحم بھی آتا اور غصہ بھی۔نفرت بھی ہوتی اور ہمدردی بھی۔

"آخر پنڈت جی کا بھی تو برابر کا قصور ہے۔۔انہیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔۔سب اُس کی بہن کی جان کے پیاسے ہو گئے ہیں۔دادی دیکھو کیسی کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی ہیں۔۔اُس کے دل میں رتن سنگھ کو لے کر کئی سوال اُبھرتے۔۔اُسے کچوتے رہتے، ڈنک مارتے رہتے۔۔لیکن پھر جواب بھی اُسے وہیں سے مل جاتا جہاں سے سوال اُٹھا کرتے۔۔

"وہ تو مالک ہیں۔۔۔ وِدوان ہیں۔۔ گیانی ہیں، برہمن ہیں۔۔ پُوجا پاٹھ سے پوتر ہو جائیں گے۔۔ پر ہم تو نیچ جات، گنوار ہیں۔۔سارا کیا دھرا روپی کا ہی ہے۔نمک حرام کہیں کی"۔۔۔وہ پھر نفرت سے بھر جاتی۔

اور پھر وہی ہوا، جو حویلی کے حاکم نے چاہا۔

حسبِ معمول ایک صبح، سب سو کر اُٹھے تو، حویلی کا ایک فرد غائب تھا۔ سُھدرا نے بہت ڈھونڈا۔ لیکن اُس کا سُراغ تک نہ مل سکا۔ وہ دیوانوں کی طرح اِدھر سے اُدھر دوڑتی روتی روتی پکارتی رہیں۔ لیکن کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ دھوئی کو پکڑا تو اُس نے آہستگی سے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے معذرت چاہ لی۔ جب ڈانٹا تو بولی۔

''مالکن، اُسے جہاں جانا تھا، وہاں پہنچ گئی۔ آرام سے سو رہی ہے، آپ شور کر کے اُسے نہ جگاؤ''۔۔ یہ کہہ منہ میں پلّو ٹھونس وہ سوکھی باوڑی کی طرف بڑھ گئی۔

دادی نے بہو کی یہ حالت دیکھی تو تن کر کڑک آواز میں حکم دیا۔

''بڑی بہو! کیوں شور مچاتی رہتی ہو۔۔ جاؤ سیدھے، اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔۔ ہم پہلے ہی پریشان ہیں۔۔۔ اور چنتائیں نہ بڑھاؤ''۔۔

اور سُھدرا۔۔۔ وحشت زدہ آنکھوں سے انہیں دیکھتیں۔۔ سب کو دیکھتیں۔۔ پھر اپنے وجود کو سوالیہ نشان بنا کر زینہ چڑھ جاتیں۔۔ دیورانی انہیں سنبھالنے آئی تو کہتیں:

''نہ بہو، مجھے نہ سمجھاؤ۔۔۔ اچھا ہوا جو ہوا۔۔ روئی اپنے آپ غائب ہو گئی۔۔۔ ورنہ رتن اُسے مَروا دیتے۔۔ اچھا ہے، اس حویلی سے اُسے مکتی مل گئی۔۔ میرا آشیرواد ہے، وہ جہاں رہے، خوش رہے''۔ یہ کہتے کہتے وہ دونوں ہاتھوں سے ہوا میں آشیرواد دینے کا اشارہ کرنے لگتیں۔ رینو، جٹھانی کو ہر طرح سے تسلی دیتی۔ رُلانے کی کوشش کرتی، لیکن کئی دنوں تک، سُھدرا کی یہی کیفیت رہی۔ صرف دیور، دیورانی اُسے تسلی دیتے۔ سنبھالتے، ورنہ ساس، سُسر اور شوہر کی ہمدردی تک اُس کے ساتھ نہیں تھی۔۔ سدرشن سنگھ کے تینوں بیٹوں کو پہلے ہی گھومنے کے بہانے راج کنور کے یہاں بھیج دیا گیا تھا۔

سُھدرا را آئی کی حالت روز بروز بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر ایک دن دادی، جیسے تیسے لکڑی ٹیکتی، رینو کا سہارا لے کر، اوپر آئیں۔

''کاہے ڈھونڈتی ہے بہوٗ! پگلی ہے توٗ۔۔سُن۔۔تیرے سہاگ نے مروادیا ہے روپی کو۔۔۔رتن سنگھ نے۔۔۔اُس کے ساتھ مر گیا، اُس کا بچہ بھی۔۔۔ دونوں کو گڑھوادیا، سوٗکھی باوڑی میں۔۔''۔

''ماں! یہ پاپ ہے، مہاپاپ۔۔۔''۔

''بہوٗ پاپ پُنّے کیا ہے۔۔تم ابھی تک نہیں سمجھیں۔۔؟۔۔ یہ سب تو ریتی رواجوں پر دھرم کی مُہروں کے نام ہیں بس۔۔اور کچھ نہیں۔۔ پھر کُل کی لاج۔۔۔سسرال کی مریادا کا بھی تمھیں دھیان ہے کہ نہیں۔۔۔بس جَن ہت کی بات ہی کرتی رہتی ہو۔۔میں کہتی ہوں، تمہارے پتی نے اُسے مارا ہے۔۔ہتّیارا ہے وہ ہتّیارا''۔۔دادی نے یہ سب اس ترکیب سے، سوگوار ہو کر کہا کہ سمھدرارانی زور سے چیخ پڑیں۔۔

''نہیں، وہ ہتّیارے نہیں ہو سکتے۔۔۔وہ ایسے نہیں ہیں۔۔آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔۔''اور وہ دھاڑیں مار مار کر رودیں۔

''ہائے وہ بچّہ بھی مر گیا۔۔دونوں مر گئے۔۔۔!

بس، سب یہی تو چاہتے تھے۔دادی نے فوراً بہو کو آنچل سے ڈھک لیا۔۔سینے سے لگالیا۔

''رولے بہوٗ! رولے۔۔۔ جی ہلکا کرلے۔۔ ہماری نیتی یہی ہے۔۔اور۔۔سمھدرا کے ساتھ تینوں عورتیں بھی زاروقطار رونے لگیں۔۔۔دادی، رینو اور دھوتی۔۔نہ معلوم کیوں۔۔اپنی اوقات پر۔۔۔حالات کی سفاکی پر۔۔۔انسان کی خودغرضی پر یا موقع پرستی پر۔۔نہ جانے کس پر۔۔۔!!

آخر جب گھٹا برس کر کھلی تو۔۔سمھدرا کو کچھ ہوش آیا۔تمام حالات پر انہوں نے پھر سے غور کیا۔۔اور کاغذ قلم لے کر نند کو تمام تفصیل، خط میں لکھ بھیجی۔۔

''راج کنور کو خط ملا تو پڑھ کر بڑا افسوس ہوا۔۔ ہے بھگوان، بھئی سا نے یہ کیا اَنرتھ کر ڈالا''۔انہوں نے دل ہی دل میں دیش نوک جانے کا فیصلہ کر۔۔شوہر سے جانے کی اجازت چاہی۔۔مرضی تو وہ

بھی تھوپتے نہیں تھے۔۔بس اتنا کہا۔

''بچّے تو یہاں آئے ہوئے ہیں، اور آپ جا رہی ہیں۔۔سب ٹھیک تو ہے نا۔۔''۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، ماں کی طبیعت ذرا ٹھیک نہیں۔۔۔ایک دن رہ کر لوٹ آؤں گی۔ روپی کو سب سمجھا دیا ہے''۔

روپی سے بھی دادا دادی سے ملنے کا بہانہ کرکے اگلے دن دلیش نوک پہنچ گئیں۔آتے ہی ماں سے ملیں۔۔انہوں نے کوئی ذکر نہیں کیا۔۔۔راج کنور نے بھی نہیں چھیڑا۔۔۔ہاں اُس کے بعد اوپر بھاوج کے پاس گئیں تو، اُن سے تفصیل سے باتیں ہوئیں۔۔بہت تکلیف پہنچی۔۔ رات دیر تک افسوس کرتی رہیں۔۔چھوٹی بھاوج کو بھی وہیں بُلا لیا تھا۔آخر رات گئے جب ماں کے پاس آ کر لیٹیں تو، ذکر کیا۔دونوں ماں بیٹی میں جم کر بحث ہوئی۔۔نیند تو کسی کو آ نہیں رہی تھی، کوسوں دور تھی چنانچہ دونوں بہوویں بھی وہیں آ گئیں۔۔آخر ماتیشوری جھنجھلا کر برسیں:

''راج ہم کہنا کیا چاہتی ہو۔تم نند بھاوج کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ استری۔ استری۔ رٹ لگا رکھی ہے۔کیا ہے یہ، کون ہے یہ۔۔ یہاں نہ استری کا مولیہ ہے نہ پُرش کا۔۔سارا کھیل سماج کے نیموں کا ہے۔نیم جیسے ہوتے ہیں، ہمیں ویسے ہی جینا پڑتا ہے۔منشے، کبھی ایک اُدیشیہ کو لے کر نہیں چل سکتا۔۔۔سمے اور حالات کے تحت بدلنا ہوتا ہے۔۔یہی سَفَل جیون کی کنجی ہے۔۔شیش سب گونڑ ہے۔۔ بے بنیاد ہے۔۔ ہر دم نئے فیصلوں کے ساتھ ہمیں بدلتے رہنا ہوتا ہے۔۔ سدھانتوں سے تو جیون کی نیّا پار ہونے سے رہی۔۔ میں کسی وِدھیالیہ میں نہیں گئی۔۔پر تجربہ سے بات کہتی ہوں۔۔ضرورت پڑنے پر ہمیں اپنے وارثوں تک کو مروا ڈالنا پڑتا ہے، کیا اِتی ہاس نہیں جانتیں۔۔پھر رکھیلوں، گنواریوں کی اولادوں کا کیا۔۔۔!!!

راج کنور، سبھدرا اور رینو۔۔تینوں ہی اس بوڑھی منطق کو سُن کر سَن رہ گئیں۔۔سارا احتجاج پانی کی طرح بہتا نظر آیا۔۔ واقعی میں وہ کوئی بڑا قدم اٹھاتی بھی تو کیسے۔۔؟۔۔ایک ساتھ اتنے تھے کہ بس چھٹپٹا کر رہ گئیں۔۔کچھ کرتی ہیں تو سبھی لپیٹے میں آتے ہیں۔۔۔چپ رہتی

ہیں تو روح بے چین رہتی ہے۔۔ضمیر ساتھ نہیں دیتا۔۔آخر۔راج کنور نے یہ فیصلہ کیا کہ صبح بھائی کی خبر تو وہ ضرور لیں گے۔

ابھی کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ ہی بجے تھے کہ سکھی رام ہانپتا کانپتا زنانے میں پہنچا۔۔دستک دی۔۔ڈیوڑھی میں دھوتی پوچھنے آئی۔''میں ہوں سکھی رام''۔۔کیا بات ہے، جلیبیں تو صبح ہی دے گئے تھے''۔

''ارے نہیں۔۔جلدی سے اندر سندیسا دے کہ ضروری کام ہے، ابھی ملنا ہے''۔

دھوتی نے دادی سے کہا تو انہوں نے سکھی رام کو اندر بلوالیا۔اُس کے چہرے پر ہوائیاں دیکھ کر، دادی، راج، دونوں کا دل انجان خوف سے دھڑکا۔

''کیا بات ہے سکھی رام''۔۔

''کچھ نہ پوچھو مالکن۔۔غضب ہوگیا۔۔۔سارے پنچ، ججمان کو لے کر رتن سنگھ پر چڑھ آئے''۔

''ہیں۔۔کہاں۔۔کب۔۔!دونوں کے منھ سے ایک ساتھ نکلا۔

''ابھی۔۔۔باہر مردانے میں سب بیٹھے ہیں۔بات بہت گرم ہے۔کیا یہ صحیح ہے کہ روپی بٹیا کو آپ شہر میں پڑھائی کروارہی ہیں''۔سکھی رام نے راج سے جاننا چاہا۔۔دادی تو اس سوال پر بغلیں جھانکنے لگیں۔لیکن راج کنور نے سختی سے پوچھا۔

''یہ آپ سے کس نے کہا۔پنچوں تک بات کیسے گئی۔''

''وہ بھیلو رانا اور اس کے کسی دوست نے۔۔جو آپ کے شہر سے یہاں آتا جاتا رہتا ہے۔وہاں کسی پارٹی مین۔۔''، سکھی رام نے ساری بات بتائی۔سکھی رام کے چہرے پر اُلجھن کے آثار تھے۔وہ بس یہی چاہتا تھا کہ راج ہاں یا نا میں جواب دے دیں۔

''اوہ۔۔!تو یہ بات ہے۔۔آخر جس کا ڈر تھا، وہی ہوا۔۔ہاں چاچا! یہ صحیح ہے''۔راج کنور نے سوچا جب حقیقت کھل ہی گئی ہے تو سچ بولنا ہی بہتر ہوگا۔دھوتی اس بیچ سبھدرا رانی کو بھی بلالائی۔

''لیکن اس میں بُرائی کیا ہے۔روپی ڈاکٹری پڑھ رہی ہے۔علاج کرے گی قصبہ بھر کا۔''

''بات بُرے بھلے کی نہیں ہے۔۔دھوکا دینے کی ہے۔۔یہ بات تھی تو پنچایت بٹھا کر اجازت لینا چاہیے تھی، آپ لوگوں کو''۔۔صاف لگ رہا تھا کہ سکھی رام تک کو یہ دھوکا دھڑی پسند نہیں آئی۔

سمھد را رانی کا چہرہ توفق ہو گیا۔''اب کیا ہو گا نڑ نند جی''۔جیسے اندھے کنویں میں انہیں دھکیل دیا ہوا اور وہاں سے بول رہی ہوں۔دم گھٹی آواز۔

''میری روپی۔۔چیر ڈالیں گے یہ لوگ''۔۔یہ کہتے کہتے وہ بیہوش ہو گئیں۔دیگر افراد کا بھی یہی عالم تھا۔وہ ہوش میں رہ کر بھی بے ہوشوں سے بدتر تھے۔بُری بلائیں کہہ کر نہیں آتیں۔۔حویلی والوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔کیا جواب دیں۔۔کیا نہ دیں۔۔سوالات کی بوچھاروں سے سب کے سب اندر تک ہل گئے تھے۔

سکھی رام سب کو متفکر چھوڑ، الٹے پاؤں مردانے کی طرف بھاگا کہ دیکھوں تو وہاں اپنے یار اور اُس کے بیٹوں پر کیا گزر رہی ہے۔

اللہ رکھا اور روپیشور سنگھ بھی آ گئے تھے۔ججمان کو بشن سنگھ نے اپنے کھاٹے پر ادب سے بٹھایا۔خود اُتر کر کرسی پر آ گئے۔پنچوں کو بھی کرسیوں پر بٹھایا گیا۔باقی کھڑے تھے، کچھ اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔رتن سنگھ اور سدرشن سنگھ مجرموں کی طرح ان کے درمیان بیٹھے تھے۔ایک بار تو سناٹا چھا گیا۔۔پھر ججمان ٹھاکر بلدیو سنگھ راٹھوڑ نے بولنا شروع کیا۔

''پنڈت بشن سنگھ، رتن سنگھ، سدرشن سنگھ اور پنچوں، ساتھیوں! ہمارے پُورو جوں کے کال سے ہی کبھی پُرہتوں نے سماج کے بنائے، نیم قاعدے، توڑنے کا دُستاہس نہیں کیا۔یُگوں یُگوں سے مان مَریاداؤں کا پالن کیا۔۔اور سُوئیچھا سے کیا۔پَرنتو، آج، اس کلیگ میں ہمارے سامنے ایسی اِستھتی اُتپن ہو گئی ہے کہ ہمیں حویلی میں یہ سبھا بُلانی پڑی۔آپ سب کی اُپستھتی میں پنڈت بشن سنگھ سے میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا یہ آروپ صحیح ہے کہ انہوں نے اپنی پوتی روپ کنور، جو کہ شادی کے کچھ ماہ بعد ہی وِدھوا ہو گئی تھی۔۔کو سماج کے سارے قاعدے قانون کا اُلنگھن کر اپنی بہن راج کنور کے ساتھ بیماری کے علاج کا بہانہ بنا کر شہر ڈاکٹری پڑھنے بھیج دیا۔کسی کو کانوں کان خبر تک

نہیں ہونے دی۔۔بشن سنگھ اس کا اُتر دیں۔۔"

سبھا میں سناٹا چھا گیا۔۔سب بشن سنگھ کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔لیکن جب وہ کچھ نہیں بولے تو ٹھاکر نے کڑک کر اُن سے جواب دینے کو کہا۔۔اس پر بشن سنگھ کانپتی ٹانگوں سے اپنی جگہ سے اُٹھے۔پگڑی اُتار کر پاس میں بیٹھے اللہ رکھا کو دی اور ہاتھ جوڑ کر، کمر خم کر، انکساری سے بولے۔۔

"ان داتا! یہ ستیہ ہے کہ میری پوتی وِدھوا ہوئی۔۔اور اُچ شِکشا کے لئے اپنی بُوا کے پاس شہر میں رہ رہی ہے۔اس بات کو میں نے چھپایا۔۔یہ بھی سچ ہے۔۔پر میری نیت کسی کو دھوکا دینے کی بالکل نہیں تھی۔روپ کنور کے بھوشیے کو دیکھتے ہوئے میری بیٹی راج کنور، اُسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔۔دو سال تو ہو گئے۔۔دو اور باقی ہیں۔۔ڈاکٹر بن گئی تو قصبہ بھر کا علاج کرے گی۔۔سب کے دُکھ درد دوُر ہو جائیں گے۔۔ہم سب نے جن کلّیانز کی بھاوَنا دیکھی، سو روپ کنور کو بھیج دیا۔ ہوشیار بچّی ہے۔ پڑھ لکھی گئی تو سیوا ہی کرے گی۔۔اب آپ ہی کہو کہ یہ بات غلط ہے کہ صحیح۔۔؟۔۔

"بات کلّیانز، ہت، اہت کی نہیں ہے بشن سنگھ جی۔۔بات ہے سماج کے نیموں کو طاق میں رکھنے کی۔۔ہمارے یہاں جب وِدھوا اِستری گھر کی چوکھٹ ہی نہ لانگھ سکے، تو آپ نے اتنا بڑا نرڑیں، اپنے آپ کیسے لے لیا۔پھر گُپت رکھا، سو الگ۔۔آپ کو معلوم ہے اس پر آپ کو ذات باہر بھی کیا جا سکتا ہے"۔ٹھاکر بلدیو سنگھ راٹھوڑ کی پیشانی پر بل پڑ چکے تھے۔رتن سنگھ اور سدرشن سنگھ تو یوں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے تھے کہ گویا اب کسی سے آنکھ ملانے کے قابل ہی نہ رہے ہوں۔

"ان داتا! کرپا کرو، ہم باپ بیٹے اس قصوُر کی بھرپائی تو نہیں کر سکتے پر آپ کے دربار سے دَیا کی کامنا کرتے ہیں"۔بشن سنگھ نے تقریباً گھگیاتے ہوئے کہا۔

اُن کی اس التجا پر جَجمان اور پنچوں نے آپس میں کچھ صلاح مشورے کیے۔ دیگر حاضرین بھی کانا پھونسی میں لگے ہوئے تھے۔تقریباً دس منٹ کے بعد ٹھاکر نے سب کو مخاطب

کیا۔

''پنچوں کے ساتھ وِچار وِمرش کے بعد یہ پریڑام نکلا ہے کہ آخری اَوسَر دیتے ہوئے روپ کنور کی پڑھائی چھڑوا کر، ایک سَپتاہ کے اندر اندر اُسے واپس حویلی میں لایا جائے۔ قصبہ والوں کے لئے ڈاکٹر کی وے وَستھا کرنا سرکار کا کام ہے۔ روپ کنور کا اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔ اور اگر ایسا نہیں کیا تو بشن سنگھ کو پریوار سہت برادری سے باہر کر دیا جائے گا۔ اور پنڈت رتن سنگھ پر دس ہزار روپئے جرمانہ واجب ہوگا۔ روپ کنور کو شہر سے لانے کے لئے پنڈت رتن سنگھ کے ساتھ سبھا کے دو سدسیہ بھی جائیں گے۔ تا کہ پھر کوئی دھوکا دھڑی نہ ہو۔ جرمانہ ادا نہ کرنے پر اُن کے پریوار کو دیس نکالا دیا جا سکتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ بشن سنگھ کے پریوار والوں کو یہ اَنتم چیتاوَنی ہے۔ یہ سبھا، سبھی کو آگیا دیتی ہے کہ سماج کے بنے ریتی رواجوں سے کسی کو کھلواڑ نہیں کرنے دیا جائے گا۔ بھوشے میں اس کا سبھی پالن کریں۔ کلیگ کی دھارا میں بہنا ہماری نِیتی نہیں۔ اس سے مَنُشّے اپنی پہچان کھو دیتا ہے۔'' ٹھاکر بلدیو سنگھ راٹھوڑ نے پنچایت اور سبھا کا فیصلہ سنایا تو سبھی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے ہامی میں گردن ہلاتے ہوئے تائید کی۔

لیکن سخت مخالفت کی گونج کے ساتھ سبھی چونک پڑے۔ ایک زنانی آواز ایسی اُبھری کہ جیسے کوئی باندھ ٹوٹ گیا ہو، کہ جیسے برق نے قہر ڈھا دیا ہو کہ جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔۔

''اِس نِرڑیں کو میں نہیں مانتی۔۔۔ آپ سب ہوتے کون ہیں ایسے فرمان جاری کرنے والے۔۔ ہم نے کوئی پاپ نہیں کیا، جو ہم ڈنڈ کے ادھیکاری ہوں۔ شِکشا پراپت کرنا کوئی جُرم نہیں۔ پھر چاہے وہ اِستری ہو یا پُرش۔۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں کیا وِدھو استری کوئی جیوت پرانی نہیں۔۔ کیوں ہم اُسے گھونٹ گھونٹ کر مار دیتے ہیں۔ سماج کے نِیم قاعدے کا وہیں تک پالن ہونا چاہئے جہاں تک وہ مَنُشّے کی پرگتی میں رکاوٹ نہ بنیں۔۔ ورنہ انہیں سمے کے ساتھ بدل دینا چاہئے۔۔ آپ سب کِس یُگ میں جی رہے ہیں۔۔ میری سمجھ سے پَرے ہے''۔ سب کی نظریں ایک ساتھ اس احتجاجی ردِعمل پر مرکوز ہو گئیں۔ راج کنور سر پر آنچل اوڑھے، نظروں کو سبھی پر

جمائے، بڑے پُروقار اور اعتماد کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اور اپنی بات کا جواب مانگتا ان کا فولادی سراپا، پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر تھا۔

پنڈت بشن سنگھ اور اُن کے بیٹوں کے تو کاٹو تو خون نہیں۔۔ یہ کیا،

''راج کی اتنی ہمت ہوگئی کہ وہ پُرش جاتی کا وِرودھ کرنے یوں سرِ عام سبھا میں آ گئی''۔ دیدی نے تو لاج شرم ہی تج دیا ہے۔ اِستری ہوکر بھری سبھا میں لوک لاج چھوڑ، یوں بے پردہ آ کر رہی سہی ناک بھی کٹوا دی''۔

کئی تاثرات تھے جو باپ بھائیوں کے دل سے نکل کر چہروں پر عیاں ہو رہے تھے۔ کہ اتنے میں رتن سنگھ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُٹھے اور شیر کی مانند جھپٹا مار کر بہن کا ہاتھ پکڑنا ہی چاہتے تھے کہ وہ دو قدم پیچھے ہٹیں اور انہیں سخت تاکید کرتے ہوئے خبردار کیا۔

''بھئی سا! آگے مت بڑھنا۔۔۔ روپی میرے پاس۔۔ کوئی مائی کا لال اُسے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔۔ انہوں نے سبھا پر مخصوص انگلی گھمائی۔۔ زور زبردستی کی تو پولیس میں رپورٹ کردوں گی۔۔۔ اور میں دیکھتی ہوں کہ یہ لوگ آپ کو بھی کیسے دنڈ دیتے ہیں۔ انہوں نے پھر سبھا پر، اور خاص طور سے ٹھاکر کی جانب دیکھ کر کہا۔۔ دیش کا قانون گونگا، بہرا تھوڑی ہے۔ اُدھار کرنا پاپ نہیں۔۔ ادھیکاروں کا ہنن کرنا پاپ ہے۔ میں ابھی شہر کی پولس کو سوچنا دیتی ہوں''۔۔۔۔ یہ کہتے ہوئے راج کنور جیسے ہی زنانے کی طرف پلٹیں، پُشت سے مارو، مارو کی ایک دو آوازوں کے ساتھ ایک شور شامل ہوگیا، اور لوگوں نے دونوں بہن بھائی پر جوتوں چپلوں کی برسات کردی۔ افراتفری مچ گئی۔ بلدیو سنگھ کا شارہ ملتے ہی لٹھیتوں نے میدان سنبھال لیا۔۔ تابڑتوڑ جو سامنے آیا، کوٹ کر رکھ دیا۔ سکھی رام، اللہ رکھا اور روپیشور آگے بڑھے تو انہیں بھی نہیں بخشا کہ اتنے میں راج کنور اور رتن سنگھ کو کسی نے حفاظت کے گھیرے میں لے لیا۔۔ نندو رام، راجکمار، بھیّاو، راما، ہنسا نے کسی طرح ان دونوں کو زنانے کی ڈیوڑھی تک پہنچایا اور پھر خاندان کے باقی افراد کی مدد کے لئے بھیڑ میں

شامل ہو گئے۔

ایک طرف طرزِ کہن تھا تو دوسری طرف تعمیرِ نو۔۔ایک طرف ظلمتِ شب تھی تو دوسری جانب نویدِ صبح۔۔۔کشاکش دیر تک چلتی رہی۔

--

(باب۔۱۴)

آج پہلی مرتبہ، راج کنور کو شدید احساس ہوا کہ نہ تو زندگی سہل ہے، نہ رواں دواں بلکہ یہ کبھی کبھی لازوال امکانات کے سراب میں قید ہو کر، ہم سے حقیقتوں کا حساب بھی مانگا کرتی ہے اور جواب بھی۔ جس کے پاس ابتدائے شوق کے خوش انجام کارنامے نہیں۔ بلکہ ناکامیوں کی پُر پیچ بھول بھلیاں ہیں۔۔ یہ بھول بھلیاں جہاں ختم ہوتی ہیں، وہاں سے شروع ہوتا ہے، طلسمات کا دشت، کہ جس کے گرداب میں پھنس کر، انسان کو اگر کچھ حاصل ہوتا ہے تو، بس سفاک سناٹوں کے اندھیرے، تیز آندھیوں کے تھپیڑے، درد کے گھنیرے سائے، کرب کی مضطرب چیخیں۔۔ نہ جانے کب سے چلا آتا ہے، یہ سیلِ رواں۔۔ آج انہوں نے جانا کہ شادی کے بعد میکہ صرف مہمان خانہ رہ جاتا ہے۔ جس گھر کے در و دیوار تک پرورش میں معاون ہوتے ہیں، وہی بیگانہ بھی بنا دیتے ہیں۔

بھری سبھا میں اپنے حقوق کی پیروی کرنا کون سا جُرم تھا۔۔ کہ جس کی اتنی بڑی سزا انہیں دی جا رہی تھی۔ آج یک زباں ہو کر سب نے انہیں ہی قصوروار ٹھہرایا۔۔ کیسے کہہ دیا، بھئی سا نے۔''راج تم ہوتی کون تھیں وہاں آنے والی''۔۔؟''تم ہوتی کون ہو روپی کو اپنے قبضے میں کرنے والی؟''تم ہوتی کون ہو۔۔ ہوتی کو۔۔ن ہو''۔ سوچتے سوچتے راج کنور کی سسکیاں نکل گئیں۔ ماں، باپ، بھائی، بھاوج، سبھی تو انہیں بُرا بھلا کہے جا رہے تھے۔ بس سبھدرا بھابی نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن طرفداری بھی تو نہیں کی۔۔ خاموشی سے سب کچھ دیکھ سُن رہی تھیں۔ اپنوں میں ہی، میں بیگانی بنا دی گئی''۔ راستے بھر راج کنور یہی سوچتی رہیں اور سخت تاسف میں گرفتا رہیں۔ لیکن انہوں نے بھی عہد کر لیا تھا کہ گھر پہنچتے ہی دیو کو ساری بات بتا دیں گی، اور اس جہالت

کے اندھیرے کا کوئی نہ کوئی مثبت و پائدار علاج ڈھونڈ نکالیں گی۔۔اب وہ چاہے پولس ہو، یا عدالت، غنڈوں کے ذریعے ہو یا شرافت سے۔۔وہ اپنے جیتے جی تو روپی کو اس اندھے کنویں میں نہیں دھکیل سکتیں۔۔۔نہیں کبھی نہیں۔۔وہ بالغ ہے، سمجھدار ہے۔۔میں نے کتنی محنت سے اس کے ذہن کی تربیت کی ہے۔اس میں اعتماد پیدا کیا ہے۔نہیں ہرگز نہیں، جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا"۔بس انہیں خیالات میں محو تھیں کہ نہ جانے کب گاڑی کوٹھی میں داخل ہوئی اور ڈرائیور کی آواز نے اُن کے انہماک کو زائل کر دیا۔

''میم صاحب۔۔۔گھر آ گیا۔۔''۔

''گھر۔۔پھر وہ کیا تھا، جسے وہ پیچھے چھوڑ آئی تھیں۔ان کے خیالات کو زبردست جھٹکا لگا، اور دل میں کچھ درد سا اٹھتا محسوس ہوا۔گھبراہٹ بڑھ گئیں۔ پسینے آنے لگے۔کار کے دروازے کا پٹ کھولا۔ڈرائیور نے جب اپنی مالک کی ایسی حالت دیکھی تو مالک مالک کہہ کر زور زور سے چلاّ نے لگا۔چوکیدار بھی اندر بھاگا۔

دیوندر اور اشوک نے سہارا دے کر راج کنور کو کار سے باہر نکالا۔اشوک نے ماں کو گود میں اٹھا کر بیڈروم میں لا کر لٹا دیا۔فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔اتنے میں روی اور روپی بھی گھبرائے ہوئے آئے۔۔روپی پاس بیٹھتے ہوئے جلدی سے پھوپی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگی۔راج کنور آنکھیں بند کئے بے سکت پڑی تھیں۔ڈاکٹر نے انجکشن لگایا اور آرام کی صلاح دی۔۔دیوندر نے ڈرائیور سے حال دریافت کیا کہ طبیعت کب بگڑی۔دلیش نوک میں تو ٹھیک تھیں کہ نہیں؟ ڈرائیور نے بتایا کہ ''طبیعت یہیں آ کر بگڑی۔۔لیکن مالکن راستے بھر خاموش تھیں''۔دلیش نوک کے ہنگامے کے متعلق راج نے ڈرائیور کو تاکید کر دی تھی کہ وہ اس کا ذکر تک کسی سے نہ کرے۔۔لیکن دیوندر سنگھ کو تشویش ہوئی کہ ضرور کچھ بات ہوئی ہے، تب ہی تو گاڑی میں خاموش تھیں''۔

جیسے تیسے، تین ساڑھے تین گھنٹے بعد راج کو ہوش آیا۔گھر بھر کو ارد گرد دیکھ کر ان کی

آنکھوں میں پانی چھلچھلا آیا۔ کچھ کہنے کے لئے لبوں کو جنبش دی، تو دیوندر نے بڑے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بات نہ کرنے کے لئے نفی میں سر ہلایا۔

"کہنے دو، دیو مجھے۔۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے"۔

"ایسی باتیں نہیں کرتے راج۔۔ تم ٹھیک ہو جاؤ، پھر خوب باتیں کریں گے۔"

"نہیں، سُنو! تم سب سُنو! انہوں نے آنکھوں اور گردن کے باہمی اشارے سے سب کو قریب بلایا اور آہستہ آہستہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات شروع کی۔

"روپی کی پڑھائی کے بارے میں، دیش نوک میں سب کو پتہ چل گیا ہے۔ وہاں جمان اور پنچوں نے مل کر حویلی پر سبھا رکھی تھی، اُس میں پتا جی اور بھنی سا کو سزا سُنا گئی کہ اگر روپ کنور کو واپس نہیں لاتے تو سزا کے بھاگیدار ہو گے۔۔۔ میں نے وِرودھ کیا۔۔ پر سب کا رہنا بسنا وہیں ہے۔۔ وہ لوگ مرنے مارنے پر اُتر آئے۔۔ بہت لے دے ہوئی۔۔۔ دَیو۔۔ میری انتم اچھا ہے کہ روپی ڈاکٹر بنے۔۔۔ اور اس کا کلینک دیش نوک میں استھاپت ہو۔۔۔ وہ لوگ ایک دو دن میں روپی کو لینے آ جائیں گے۔ تم کسی طرح اُسے روک لینا"۔۔ انہوں نے روپی کے سر پر ہاتھ رکھا، جو بالکل قریب، ان کے بازوؤں کے نزدیک اُن پر تقریباً جھکی ہوئی بڑے دھیان سے ساری بات سُن رہی تھی۔۔۔" "اور حویلی والوں کو بھی بچا لینا۔۔ ان معصوموں کو روُڑی وادی راستوں پر چلنے نہ دینا"۔۔ انہوں نے تینوں بھتیجوں پر شفقت کی نظر ڈالی۔۔ اور اتنا کہہ اپنی آنکھیں دیوندر سنگھ کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔۔۔ پُر امید اور کامل یقین کے ساتھ۔۔ بیوی کی بات اور جذبات کا احترام کرنے والے شوہر نے بیٹوں کی جانب باری باری سے دیکھا۔۔ روپی پر نظر ڈالی۔۔ سب نے آنکھوں اور گردن کے اشارے سے اثبات میں یقین دلایا۔ دیوندر کو تقویت ملی اور انہوں نے بڑے عزم کے ساتھ بیوی سے کہا۔ "تمہاری اچھا ضرور پوری ہوگی راج"۔

"سچ دیو۔۔ راج کی آنکھوں میں جگنو چمک اٹھے تو دیو کے دل کی کلی کلی کھل گئی۔

"ہاں، ہاں"۔۔ دیوندر نے بیوی کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بھرپور تسلی دی۔

''دیو۔۔۔ہماری حویلی پر بہت بُرا وقت آیا ہوا ہے۔۔اُنہیں سکو بچالو۔۔دیو۔۔۔بچالو۔۔۔یہ کہتے کہتے انہیں زور کی سسکی آئی اور ختم۔۔۔دونوں ہاتھ دیوندر کے ہاتھوں میں جھولتے رہ گئے۔۔آنکھیں شوہر کے وعدے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔۔دیوندر کو تو ایسا لگا جیسے زندگی ٹھہر گئی ہو۔ اُجاڑ اور ویران سناٹوں نے انہیں گھیر لیا۔

''راج، یہ کیا، اتنی جلدی بھی کوئی ساتھ چھوڑتا ہے بھلا۔۔ابھی تو تمہیں بہت کچھ کرنا تھا۔اتنے کام تھے۔۔دھوکا دے دیا نا اپنے دیو کو۔۔۔کر دیا نا اکیلا مجھے۔۔۔نہیں راج۔۔تم یوں جانے کا فیصلہ اکیلے اکیلے نہیں کر سکتیں۔۔تم تو ہر بات مجھ سے پوچھتی تھیں۔۔پھر آج یہ ہم فیصلہ، تنہا کیسے لے لیا''۔۔دیوندر سنگھ، راج کنور کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر دیوانہ وار سوال پہ سوال کئے چلے جا رہے تھے۔آخر بڑے بیٹے اشوک نے انہیں سنبھالا۔حالانکہ اُن سب کا بھی بُرا حال تھا۔۔آج اُن سے اُن کی ایک پیاری ماں، ایک دوست، ایک ہمدرد، ایک رہنما۔۔دور، بہت دور جا چکی تھیں۔۔۔یہ سب کیسے ہو گیا۔۔۔ماں۔۔واپس آجاؤ۔۔۔ماں''۔۔چھوٹے بیٹے کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا تھا۔۔روپی کے اندر بھی سب کچھ شائیں شائیں کر رہا تھا۔لیکن اُس نے اس پُرسوز ماحول کو سنبھالنے کی سعی کرتے ہوئے دونوں بھائیوں کو گلے سے لگایا۔۔اور پھوپا کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ کر ڈھارس دیتے ہوئے، تسکین پہنچانے کی کوشش کی۔روتے بلکتے تینوں چچازاد بھائیوں کو سنبھالا۔

ڈرائیور کو الٹے پاؤں دیش نوک دوڑایا گیا۔حویلی والے تو جیسے سکتے میں آگئے۔ بوڑھے ماں باپ پر تو جیسے قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔حالات ہی کچھ اس تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے کہ عقل حیران تھی۔کسے قصوروار ٹھہرائیں، کسے نہیں۔۔اب مشکل یہ تھی کہ گھر کے مرد جاتے ہیں تو، ان کی غیر موجودگی میں، قصبہ والے نہ معلوم کیا کچھ کر بیٹھیں۔۔ابھی دو ہی دن ہوئے تھے، تناتنی ہوئے۔گھر پر پہرہ لگا ہوا تھا۔رتن سنگھ نے اپنے لٹھیتوں کی تعداد بڑھا کر تعینات کر دیا تھا۔ سکھی رام، اللہ رکھا اور روپیشور سنگھ بھی وہیں رہ رہے تھے۔راج کمار، بھیلورانا، راما اور ہنسا نے باہر

کا مورچہ سنبھال رکھا تھا۔ نندورام، تیل پلا یا لٹھ لئے چوبیس گھنٹے پھاٹک پر بیٹھا پہرہ دیتا رہتا۔

حالانکہ یہ سب ہی بھیلو رانا سے سخت خفا تھے۔ لیکن جب اُس نے اپنی صفائی میں سارا ماجرا کہہ سنایا اور راجو نے اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ سارا قصور اُس سرپنچ کا ہے۔ اُسی نے یہ آگ لگائی۔۔ بھیلو نے بتایا کہ کیسے وہ اور بھوپتی، مندر کے پچھواڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ نہ جانے سرپنچ ہیرالال کہاں سے آن ٹپکا۔ اور چوری چھپے اُس نے ہماری باتیں سُن لیں۔۔ سارا کیا دھرا اُسی کا ہے۔ آن کی آن میں، نمک مرچ لگا کر، جمان تک، بیکانیر جا پہنچا۔۔ اور بات اتنی بڑھ گئی۔۔ پھر بھی راجکمار نے اُسے ڈانٹا کہ ''ایسی باتیں کھلے میں نہیں کی جاتیں۔۔ قصور تیرا بھی ہے''۔

اور اُس قصور کا تدارک وہ اب کر رہا تھا کہ حفاظتی دستے میں پیش پیش تھا۔ غرض یہ کہ تمام افراد نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ صرف بشن سنگھ اور رتن سنگھ شہر جائیں۔ سدرشن، جوگندر گھر پر رہیں۔ کوئی پوچھے تو ساری بات بتا دی جائے اور ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا جائے کہ روپ کنور کو وہ اپنے ہمراہ ہی لائیں گے۔

گھر میں تین دن تک سخت، ماتمی ماحول رہا۔۔ خود رتن سنگھ بلک بلک روئے۔ اکلوتی بہن، اور اسے بھی انہوں نے ناراض کر کے بڑی بے عزّتی سے گھر سے نکالا تھا۔ ''افسوس کہ بہن سے معافی تک نہ مانگ سکا۔ آخر ہماری بھلائی کے لئے ہی تو راج نے اتنا بڑا قدم اٹھانے کا ساہس کیا تھا''۔۔ بس یہ سوچتے اور جھر جھر آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ باپ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ تیجے کے دن حواس کچھ معمول پر آئے تو رات کو سب ایک جگہ بیٹھے۔۔ دیوندر نے بڑی سنجیدگی و شائستگی سے دیش نوک کے تمام حالات کی تفصیل پوچھی۔۔۔ رتن سنگھ نے انہیں ایک ایک بات بتائی۔۔ اس پر دیوندر کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر انہوں نے روپ کنور کو مخاطب کیا۔۔

''روپی، کیا تم جانا چاہتی ہو۔۔؟'' روپ کنور بڑے تذبذب میں تھی۔ ایک طرف کیریئر، پہاڑ جیسی زندگی اور دوسری طرف سارا خاندان۔۔ اس کی بدنامی۔۔ تباہی۔۔۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔

اُس نے کہا۔۔ ''آپ سب لوگ جیسا اُچت سمجھیں۔ میرے لئے تو ایک طرف کھائی، دوسری طرف کنواں ہے۔ پھر بُوا کے یوں اچانک چلے جانے سے مجھ میں تو وِچار کرنے کی شکتی ہی نہیں رہی۔ پر اتنا ضرور کہوں گی کہ میری اچھا ہی سب کچھ نہیں بلکہ بُوا سا کی اَنتم اِچھا ہم سب کے لئے سَروَوپری ہے''۔۔ یہ کہہ کر روپی رُندھی گلے سے چپ ہوگئی۔ اُس سے آگے بولا ہی نہیں گیا۔

''سسَر سا! آپ فرمائیں''۔۔ دیوندر بشن سنگھ سے مخاطب ہوئے۔

''مانا کہ راج کی اَنتم اِچھا کو ہمیں پورا کرنا چاہئے۔۔ پر جوائیں راجا۔۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے۔۔ ہم سب پر کیا بیت گئی ہے اور کیا بیت رہی ہے۔۔ ایک بار تو دنگا ہو ہی گیا ہے۔۔ پوری شانتی اب بھی نہیں ہے۔ حالات کبھی بھی بگڑ سکتے ہیں۔۔ پھر اگر پولس کا سہارا لیں تو کورٹ کچہری تک معاملہ جائے گا۔ پورے قصبے سے ٹکر لینا معمولی بات نہیں۔۔ پھر یہ رنجش ابھی پڑ گئی تو، پیڑھیوں تک نبٹارا نہ ہو سکے گا۔ اور آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔۔''بشن سنگھ نے گویا دور اندیشی سے کام لیا۔

''لیکن دادا جی! یوں دب کر ہم کب تک اپنا شوشن کرواتے رہیں گے''۔ روپی نے بڑی ہمت کر کے پہلی بار دادا کے سامنے منھ کھولا۔

''بٹو! تم بالکل اپنی بُوا پر گئی ہو۔ ویسی ہی بات کرتی ہو۔۔ پر اس کا پریڑام کیا ہوا، تم جان ہی گئی ہو۔۔ ہماری لاشوں پر سے ہوکر، اگر تم کالج جانا چاہو تو، اپنی مرضی کرو۔ ورنہ سب کی بھلائی اسی میں ہے کہ تم واپس چلی چلو''۔۔ بشن سنگھ نے کچھ جھنجھلاہٹ اور کچھ بے بسی سے کہا۔

''اسے چلنا ہی پڑے گا پِتا شری۔۔ راج کی اِچھا اور اسکے بھوِشے کی خاطر تو ہماری یہ اِستھتی ہوگئی کہ کل تک جو لوگ حویلی کی طرف آنکھ اُٹھانے کی ہمت نہیں کرتے تھے، آج بے عزت کرنے پر تلے ہیں۔ رہنا بسنا وہیں ہے۔ پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں کیا جاتا۔۔ میں آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگل سکتا۔۔۔ رہی راج کی اَنتم اِچھا کی بات تو اُس میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوتو اِچھائیں بھی پوری کرنے کو جی چاہتا ہے آپ سبھی دیکھ رہے ہیں، یہاں تو سب کچھ ہی بگڑ رہا ہے۔۔ بکھر

رہا ہے''۔۔رتن سنگھ کو غصہ بھی آرہا تھا اور جھونجھل بھی۔

''ایک اُپائے ہے''۔دیوندر نے گہری سوچ سے باہر آتے ہوئے کہا۔سب اُن کی جانب غیر یقینی نظروں سے دیکھنے لگے۔

''آپ سب یہاں شہر میں بَس جائیں۔۔میرا لمبا چوڑا کاروبار ہے۔۔اس میں ہاتھ بٹائیے''۔ تجویز سن کر روپی اور تینوں چچازاد بھائیوں کے چہرے پر کچھ چمک آئی۔اشوک، روی اور پریم سنگھ، جواب تک خاموش تھے۔۔کچھ ہلے ڈُلے اور بڑی امید سے رتن سنگھ اور بشن سنگھ کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔۔روی تو انگلیاں چٹکانے لگا۔

''اسمھو۔۔بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔۔بیٹی کے گھر کا پانی پینے کی ریت نہیں اور آپ نوکری کی بات کرر ہے ہیں''۔۔بشن سنگھ کچھ بپھرے۔

''پتا شری بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں''۔رتن نے دیوندر کی طرف دیکھتے ہوئے جملے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہم آپ کے وچاروں اور بھاؤنا کا آدر کرتے ہیں، جوائی جی! آپ نے اپنی طرف سے روپی کے لئے وہ سب کچھ کیا، جو ایک باپ ہو کر میں نہ کر سکا۔ پر بات ایک کی نہیں، پورے خاندان کی ہے۔بھلا اتنی آسانی سے، اپنی جگہ، کبھی چھوٹتی ہے۔پھر ہمیں بزنس کا لین دین بھی کہاں آتا ہے۔ پنچایت نے ہمیں سات دن کا سمے دیا ہے۔۔کل چھٹا دن ہے''۔۔روپی کی طرف مخاطب ہو کر۔۔''سامان باندھ روپی۔۔کل تڑکے ہی ہمیں دیش نوک نکلنا ہے، ورنہ ساتویں دن وہ لوگ حویلی کو آگ بھی لگا سکتے ہیں''۔۔رتن سنگھ کے آخری جملے کے متعلق سوچ کر ہی روپ کنور اندر تک کانپ گئی۔تینوں چھوٹے بھائی سہم گئے۔۔اشوک، روی اور پریم سنگھ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرر ہے تھے۔پھر بھی اشوک نے ہمت کی۔

''ماما سا! ڈیڈی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔یہ لڑائی ہم سب کی ہے۔کچھ secrefice تو کرنا ہی پڑے گا۔ اور اگر وہیں رہنا ہے تو پھر ہم پر بھروسہ کیجئے'' اُس نے دونوں بھائیوں کی طرف

دیکھا، جنہوں نے اس کی حمایت میں سر ہلایا"۔۔"ہم اپنے طور پر اُن سے نبٹ لیں گے"۔۔
"اپنی لڑائی خود لڑنا چاہیے۔۔سارے پریوار کو جھونکنا بُدھیمانی نہیں"۔
"آپ کوئی راستہ نکالنے کی بجائے، اُسی طرف جا رہے ہیں۔۔کب تک ہمیں جھونکتے رہیں گے، ان رواجوں کی بھٹی میں"۔۔روپ کنور کے لہجے میں تیزی تھی مگر آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔
"پھر تو نے زبان چلائی۔اب کی بار میرا ہاتھ اُٹھ جائے گا روپی۔۔ایک تیری اکیلی کی خاطر میں اتنوں کی بلی نہیں چڑھا سکتا۔۔۔پڑھ لیا، جتنا پڑھنا تھا۔۔تیری ضد کے آگے ان بوڑھوں کی عزت دو کوڑی کی بھی نہیں رہی۔

غرض یہ کہ بات اتنی بڑھی کہ روپی نے جانے سے انکار کر دیا۔۔مگر باپ دادا بضد تھے کہ ہم لے کر ہی جائیں گے۔۔اور ہوا بھی یہی۔۔۔رات کے پچھلے پہر، جبکہ سب گہری نیند سو رہے تھے، پنڈت رتن سنگھ بیٹی کے کمرہ میں دبے پاؤں گھسے۔۔اور اُسے سوتے میں بیہوشی کی دوا سونگھا کر پہلے سے انتظام کی گئی گاڑی میں ڈالا، کمرے میں اُس کا جتنا موٹا موٹا سامان تھا جو بھی ہاتھ آتا گیا۔اُسے جلدی جلدی ایک بے ترتیب پوٹلی میں لپیٹا، گاڑی کی ڈِگی میں رکھا اور راتوں رات وہاں سے روانہ ہو گئے۔۔دیوندر سنگھ کی آنکھ کھل گئی تھی۔۔لیکن وہ ساری حرکتیں چپ چاپ دیکھتے رہے۔۔کیا کرتے اور کیا بولتے۔۔بس اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئے۔
"میں بولوں گا تو ہو گا بھی کیا۔۔۔میرا اختیار ہی کتنا ہے بھلا۔۔۔پھر اب یہ گھر مردوں کا رہ گیا ہے، کوئی اپنی جوان بیٹی کو کیوں یہاں چھوڑے گا۔۔۔کاش روپی میری بیٹی ہوتی۔۔اور۔۔۔
انہوں نے ٹمٹماتے تاروں کی جانب، کھڑکی میں سے دیکھا۔۔بے اختیار منہ سے نکلا۔۔راج "I am very sorry" اگلے ہی پل وہ سِگار کے گاڑھے دھوئیں میں غرق ہو گئے۔

تقریباً چار گھنٹے بعد، آدھے راستے میں روپی کو ہوش آیا۔آنکھیں کھولیں تو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔بشن سنگھ نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"نہ بٹو، حیران نہ ہو۔۔اپنے گھر چل رہے ہیں"۔

''اپنے گھر۔۔۔اپنے گھ۔۔۔ر۔۔۔ر''۔روپ کنور کو لگا جیسے اُس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔۔اُسے اپنے باپ دادا سے ایسی امید قطعی نہیں تھی۔۔بس منہ سے اتنا نکلا کہ ''میری کتابیں''۔۔اور پھر ایسی چپّی لگی کہ جیسے پیدائشی گونگی بہری ہو۔۔خالی آنکھیں۔۔خالی دل، خالی دماغ۔۔اور خالی زندگی۔۔اُس کا ماضی بڑی تیزی کے ساتھ اُس کے سامنے آکر ننگا رقص کرنے لگا۔۔ بیوگی۔۔اندھیرا پگ۔۔۔بوسیدہ کوٹھری۔۔نشارا۔۔۔اور بانی سے برتن رگڑتی ،۔۔ بوڑھی تائی۔۔۔نہیں۔۔بوڑھی روپی۔۔بوڑھی بِتّو''۔۔گاڑی کی رفتار بڑھتی ہی جارہی تھی۔۔صبح ساتواں دن جو تھا۔۔پَو پھٹنے سے قبل، ٹھاکر کے چرنوں میں روپ کنور کو جو پیش کرنا تھا۔

ٹھاکر بلدیو سنگھ راٹھوڑ نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اپنی کلف دار دھوتی کے ایک کونے کو دائیں ہاتھ میں پکڑا، اور بائیں ہاتھ سے روپی کے پلّو کو چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے للچائے لہجہ میں ایسے چھیڑا، جیسے اب رال ٹپک جائے گی۔

''بھئی، بُوا کا جلوہ تو دیکھ ہی لیا، دیکھیں بھتیجی کا رُوپ کیسا ہے''۔۔روپی نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ٹھاکر کے ہاتھ کو پَرے جھٹک دیا۔۔اور غصہ سے چہرے کا رُخ دوسری طرف کرلیا۔بشن سنگھ تو خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے، لیکن رتن سنگھ نے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''اَن داتا، آپ کا کہنا ہوا۔۔اب ہمیں شبھ گھر آگیا دیں۔۔یوں بہو بیٹیوں کو ہاتھ لگانا شوبھا نہیں دیتا''۔۔ٹھاکر رتن سنگھ کے تیوروں کو منٹ بھر میں سمجھ گئے۔فوراً اپنے لہجہ میں نرمی وشائستگی لاتے ہوئے کہا۔

''ارے، یہ تو ہماری پُتری سمان ہے، لو تم کہتے ہو تو ہٹا لیتے ہیں اپنی نظر۔۔''اور واقعی، انہوں نے ایسے نظر ہٹالی، جیسے ہوس کے شرارے اُن کے آس پاس پھٹکے ہی نہیں تھے۔

''جے رام جی کی۔۔بھَور ہونے پر پھر اُستھتی دوں گا''۔یہ کہتے ہوئے رتن سنگھ گاڑی میں آگے کی سیٹ پر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔اور ڈرائیور کو حویلی کا راستہ بتانے لگے۔۔

روپی کے آنے سے، حویلی والوں کی گویا جان میں جان آئی۔۔مرجھائے چہرے کھِل

تو اُٹھے لیکن روپّی کی نظروں سے بچ کر کھِلے۔۔دادی، ماں، چچی، چچا۔۔سبھی نے جب یہ سُنا کہ روپّی کو جمان ٹھاکر سے ملوادیا گیا ہے تو، ہرایک نے چین کی سانس لی۔۔کسی نے سوچا۔۔۔بھگوان نے بچالیا، کسی نے سوچا دیوی نے کرپا کی۔۔۔کسی نے سوچا۔۔ایک بوجھ تھا، جو سر سے اُترا۔۔اور معلوم نہیں کیا کیا سوچا گیا۔۔۔لیکن روپّی۔۔اُس نے تو نہ کسی سے نظریں ملائیں، نہ بات کی۔۔بس گاڑی سے اُتر کر، ڈِگی میں سے اُتاری گئی پوٹلی کو بمشکل اُٹھایا کہ چچا نے سہارا دیا۔۔اُن کا ہاتھ جھٹک کر، خود ہی کسی طرح پوٹلی کو اُٹھاتی، گھسیٹتی اپنی کوٹھری میں لے گئی۔۔زنگ آلود تالا پہلے سے کھول دیا گیا تھا۔روپّی نے اندر سے کواڑ بند کر، کُنڈی لگائی اور پوٹلی کے ڈھیر پر خود بھی ڈھیر ہوگئی۔

ٹھیک دس بجے ٹھاکر بلدیو سنگھ کے ٹھکانے پر سبھا رکھی گئی۔لیکن اب اُس کا رنگ ہی دوسرا تھا۔اپنی جیت کے ست رنگی نشے میں چُور، قصبہ کے عہدے داران کا آنا شروع ہوگیا تھا۔پنڈت بشن سنگھ، رتن سنگھ، سکھی رام، اللہ رکھا اور روپیشور بھی مع لٹھیتوں کے ٹھکانے پہنچے۔۔ٹھکانے کی حویلی کے بلند دروازہ پر ٹھاکر کی سواری کے لئے بہترین نسل کا سجا دھجا اونٹ کھڑا جگالی کر رہا تھا۔زیورات سے آراستہ اس اونٹ نے پلانڑ[1]، مورکھا[2]، اونٹ کا تنگ[3]، مَنیوں[4] کا ہار، جھالرئی[5]، گوڈیا[6]، پارچنی[7] اور گوربند[8]۔۔سبھی کچھ پہن رکھا تھا۔۔۔کمر سے کُریا (پینے کے پانی کی بوتل یہ چمڑے کی بنی ہوتی ہے) بھی بندھی تھی۔

۱۔پیلانڑ(Pilan)(کاٹھی)Decorated Saddle۔ ۲۔مورکھا(morkha)۔Bridles

۳۔اونٹ کا تنگ(unt ka tang)،Girth, camel belt۔

۴۔منیوں کا ہارSpecial garment & necklaces۔

۵۔جھالرئی،blanket۔ ۶۔گوڈیاleg ornamats۔ ۷۔پارچنیTail ornaments۔

۸۔گوربند:neck piece گوز بیں، موتی، بٹن، ریشم کے دھاگے، کلابتو، کلاوا اور کانچ کے ٹکڑوں سے بناتے ہیں۔

Gorbandh(big necklace): There was a newly wedded woamn, who observed nine days fast in the hope that when her husband would return home after long sepration, she would present the gorbandh to her husband. It was made by her, for her lover's ...

روپیشور کے تصور میں اپنا اونٹ، اپنی سواری، اس کی سج دھج، اُس کی رفتار سب کچھ چند لمحوں میں کوندھ گئی۔ انہیں وہ دن بھی یاد آئے جب برادری کی حسینائیں ان کے اونٹ کے لئے بڑے شوق اور رومان سے، اپنے ہاتھوں سے گور بند بنایا کرتی تھیں اور "عالی جاہ، مہارو گور بند نکھرالو" گا گا کر متوجہ کرتی تھیں۔۔انہیں یہ انتظار رہتا کہ "کاش یہ گور بند روپیشور سنگھ اپنے اونٹ کے لئے سُو پکار کرلیں"۔۔وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے سب کے ساتھ اندر چل دیئے۔

آج کوئی بہت بڑا مجمع نہیں تھا بلکہ خاص خاص افراد کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ سبھا شروع ہوئی۔۔اور خاموشی طاری ہوگئی۔۔ پنڈت رتن سنگھ نے باقاعدہ روپ کنور کو لانے کی بات قبول کی۔اور آئندہ کے لئے پنچایت کو اندھیرے میں نہ رکھنے کی قسم کھائی۔۔۔عہد کیا۔۔ٹھاکر نے بھی روپی کے آن کی تصدیق کردی۔۔ پھر کیا تھا۔فوراً "ریانز" کی رسم شروع ہوگئی۔۔ایک بڑے پیالے میں افیم کا گھول لایا گیا۔۔اس "اَمل" میں روئی کا پھویا بھگو بھگو کر باری باری سے سب کی ہتھیلیوں پر نچوڑا گیا۔۔اور اس طرح افیم کی ایک ایک گھونٹ سب نے پی کر جشن منایا۔۔ دیر تک یہ عمل چلتا رہا۔۔ جب ذرا سرُور چڑھا تو ٹھاکر کچھ زیادہ ہی بہکنے لگا۔۔"واہ! ہمت ہو تو راج کنور جیسی، روپ ہو تو روپ کنور جیسا" اس پر پنڈت رتن سنگھ بگڑنے لگے تو آپس میں لوگوں نے بیچ بچاؤ کروا کر معاملہ ٹھنڈا کروایا۔

اُدھر، سمھد رارانی دو تین مرتبہ، جا، جا کر روپی کی کوٹھری کا کواڑ بجاتی رہیں۔۔لیکن اُس نے دروازہ نہیں کھولا۔۔آخر دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا۔۔وہ کھانا لے کر پھر آئیں۔۔ کواڑ کھنکھنایا۔۔پھر وہی خاموشی، دروازہ نہیں کھُلا۔۔وہ ایک ایک سے کہتی رہیں۔۔

...beloved camal, but before her wishwas fulfilled, it was stolen by someone. Te song says--
I prepared the Gorbandh while takig the cows for grazing,
I lover the beads while taking the buffaloes for grazing,
My Gorband is a romantic one.
I prepared the Gorbandh with the help on my younger
and elder sister in laws,
My Gorbandh is romantic

"روپی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ بھگوان کے لئے دروازہ کھلواؤ"۔ مگر کسی کے جوں تک نہیں رینگی۔۔ آخر شام پانچ بجے ٹھکانے سے جب مرد آئے تو، سھدرا نے رتن سنگھ سے رو رو کر روپی کے بھوکے پیاسے ہونے کا ذکر کیا۔

"ارے۔۔۔ے۔۔" باپ کو بھی تشویں ہوئی کہ کہیں۔۔ اور انہوں نے کچھ دیر تو دروازہ کھٹکھٹایا، جب کوئی ہلچل نہیں ہوئی تو دونوں بھائیوں نے مل کر دروازہ توڑ دیا۔ روپی کتابوں کے ڈھیر پر بیہوشی کے عالم میں پائی گئی۔۔ پسینے سے تربتر۔۔ فوراً، رتن سنگھ نے اُسے گود میں اُٹھایا اور اوپر اپنے کمرے میں لے جانے لگے۔۔ دادی نے مخالفت کرنا چاہی، جسے انہوں نے یہ کہتے ہوئے نظرانداز کر دیا کہ "اب تو اس کا پیچھا چھوڑ دو، ادھ مری ہوگئی، ہماری بٹیا"۔ سھدرا نے بھی اُن کو کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔۔ اور شوہر کے ساتھ زینہ چڑھنے لگیں۔۔ کمرہ میں پنکھے کی ہوا سے روپی کا پسینہ سوکھا، ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دے گئے، ہاتھ پاؤں سہلائے گئے، تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کے جسم میں معمولی حرکت ہوئی۔ سھدرا نے بیٹی کو آواز دے کر ہوش میں لانے کی کوشش کی۔۔ روپ نے آنکھیں کھولیں اور منھ سے نکلا۔۔ پانی۔۔ سھدرا نے چمچ سے آہستہ آہستہ پھلوں کا رس اس کے منھ میں انڈیلا، تقریباً آدھا گلاس بمشکل پی کر روپی نے انکار کر دیا۔ سھدرا نے زیادہ زور نہیں دیا۔۔ گلاس ایک طرف رکھ، بیٹی کے سر کو اپنی گود میں لے کر دھیرے دھیرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔۔ روپی نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔۔ سھدرا نے دیکھا۔۔ پیلا چہرہ، سوکھے ہونٹ، دُبلا پتلا سراپا۔۔ "چچ، چچ۔۔ کیا ملا میری بچی کو آج تک۔۔ ہم نے اس سے ہر خوشی چھین لی۔ اب پھر گھسیٹ لائے اُسے اس نرک میں"۔ انہوں نے اپنی کوکھ کی جانب دیکھا، پھر بیٹی کو دیکھا۔۔ پھر۔۔ انہوں نے سماج پر لعنت بھیجی، نظام پر لعنت بھیجی، اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔۔ بس پچھتاوے کا مجسمہ بنی دیر تک وہ بیٹی کو نہارتی رہیں۔

اتنے میں خواتین کی آوازیں ان کے کانوں سے ٹکرائیں۔۔۔ نیچے دادی کے پاس کچھ رشتے دار آئیں تھیں۔۔ روپی کے متعلق دریافت کرنے، تصدیق کرنے یا ٹوہ لینے۔۔ لیکن

روپی کی کوٹھری کا دروازہ ٹوٹا دیکھا تو لگیں اعتراض کرنے۔۔ماتیشوری نے انہیں لاکھ سمجھایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے، اُس کو بیہوشی کے عالم میں رتن اوپر لے کر گئے ہیں۔۔لیکن وہ کیا مانتی تھیں۔۔بس باتیں بنانا شروع کر دیں۔۔عجب ان کی گفتگو تھی۔۔ایک مرتبہ ہمدردی جتاتیں تو دوسری بات اعتراض کر دیتیں۔

روپ کنور کو اب اچھی طرح ہوش آ گیا تھا۔ماں نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔۔تکیے لگا کر بٹھایا۔۔۔کھانا کھلایا۔۔اُس نے خاموشی سے سب کر لیا۔۔اتنے میں دو تین خواتین زینہ چڑھ کر اوپر آ گئیں۔۔سھدرا نے انہیں پرنام کیا اور مسہری سے اُتر کر پاؤں چھوئے، ٹخنوں تک دبائے پھر کُرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔۔اس اثناء میں خواتین روپی کو مسلسل گھورتی رہیں۔۔جس کی حالت میں اب کافی افاقہ نظر آ رہا تھا۔۔انہیں ماتیشوری کی بات جھوٹ لگنے لگی۔۔وہ کُرسیوں پر بیٹھیں۔۔سھدرا سے روپی کا حال چال جاننے کے بعد لگیں باتیں مٹھولنے۔۔

''ہم آئے تو تمہاری ساسُو ماں نے بتایا کہ روپ کنور کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔کوٹھری کا دروازہ بھی ٹوٹا پڑا ہے۔۔ہاں بھئی ان کوٹھریوں میں جھروکہ بھی تو نہیں ہوتا۔۔ہوا آنے کے لئے'' دوسری نے پہلی کو کہنی کا ٹلا مارتے ہوئے سھدرا سے کہا۔

''تم بھی سھدرا، ہاتھ کا پنکھا نہیں رکھا بیٹی کے لئے، گرمی سے طبیعت بگڑ گئی ہوگی۔۔بے چاری کی''۔۔''ہاں بھئی، بُوا کے ایئر کنڈیشنوں میں رہ کر جو آئی ہے، لاڈلی۔۔'' تیسری نے لقمہ دیا۔ان کی ان باتوں سے سھدرا نے گھبرا کر بیٹی کی جانب دیکھا۔۔

روپی نے ان کی زہریلی ہمدردی کی تاثیر کو محسوس کیا اور چپ چاپ مسہری سے اُتر کر نیچے جانے لگی۔۔سھدرا رارانی منع کرتی رہ گئیں۔۔سہارا دیتی رہ گئیں۔۔لیکن روپی۔۔تنکے کھاتی، سر کو تھامتی، بوجھل قدموں سے زینہ اُترتی ہی رہی۔۔اُس نے زینے سے اپنی کوٹھری کی جانب دیکھا۔گنجی پھونسی بڑھیا اور بوڑھی تائی اُسے دروازے پر کھڑی معنی خیز مسکراہٹ لئے، اشارے سے بلا رہی تھیں اور وہ ان کی آغوش میں پناہ لینے کو مجبور تھی۔

قصبہ میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ روپ کنور واپس آ گئی۔۔ راجکمار نے سُنا تو، اُسے گہرا دھکا لگا۔۔

''کیا اچھا ہوتا اگر یہ راز سال دو سال اور چھپا رہتا۔۔ روپ کنور ڈاکٹر بن کر آتی۔۔ سب کا علاج کرتی۔۔ پڑ ابر تی۔۔ میں بھی اپنا علاج کراتا۔۔ وہ کہتی۔۔ ''تم ٹھیک ہو''۔۔ میں کہتا۔۔ ''بیمار ہوں''۔۔ وہ کہتی۔۔ ''کیا بیماری ہے''۔۔۔ میں کہتا۔۔ ''دل کی''۔۔ راجکمار آپ ہی آپ شرما گیا۔۔ خود اپنے آپ سے۔۔ لیکن پھر دوسرے ہی پل اُداس ہوگیا۔۔ ''اُس کے ساتھ یہ کیسا اَنرتھ کر ڈالا۔۔ اب وہی گھٹ گھٹ کر، تل تل مرنا پڑے گا، اُسے۔۔ کیسی کونپل جیسی نرم نرم ہے۔۔ کسی کو دیا کیوں نہیں آتی، اُس پر''۔۔ اُسے بھیلو پر غصہ آنے لگا۔۔ اُس کا جی چاہا۔۔ گلا دبا دے، اُس کا۔۔ اور اُس بھوتنی کو کچا چبا جائے۔۔ سالے۔۔ کتنے سَرل بنتے ہیں۔۔ پر ایسے لوگوں کا، کسی کے راز کو سینے میں دفن کرتے ہوئے دم گھٹنے لگتا ہے۔۔ حرامی۔۔ اُس سرپنچ نے بھی نہ جانے کون سی دشمنی نکالی۔۔۔ اکیلا کہیں مل جائے تو مار مار کر بھرتا بنادوں، کمینے کا۔۔''

لیکن راجکمار، نہ تو کسی کا گلا دبا سکا، نہ کچا چبا سکا۔۔ نہ بھرتا بنا سکا، نہ چین سے جی سکا۔۔ ہر وقت مضطرب اور خاموش رہنے لگا تھا وہ۔۔ جیسے دق کا مریض ہو۔

زندگی کے شب و روز بنا کسی مقصد کے یونہی گزرتے رہے۔ سانسیں تھی، جو معمول کے مطابق عمر کو دھکیل رہی تھیں۔ سامان کے ساتھ آئیں، کچھ کتابیں اور نوٹس تھے، جنہیں روپی نے اب بھی سینے سے لگا رکھا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر، روز رات کو وہ اُن میں غرق ہو جاتی۔ لیکن غرق ہونے کے لئے گہرائی چاہئے۔۔ ورنہ تشنگی، جنون کی حد کو پار کر لیتی ہے۔ روپی کا بھی کچھ یہی حال تھا۔۔ چند کتابیں اور دو تین فائلیں۔۔ یہی تو اب اُس کا کُل سرمایہ تھا۔ نوٹس تیار کرتی تو قلم ان مرحلوں پر آ کر ٹھہر جاتا جہاں ایک کے لئے دس کتابوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔۔ لیکن یہ دس کتابیں۔۔۔؟ بس رات جھنجھلاہٹ، غصّے اور بے بسی کے عالم میں گزر جاتی۔ اُس کا جنون اُسے

حدوں کو پار کرنے کے لئے للکارتا۔ بغاوت پر اُکساتا۔۔اب نہ وہ کسی سے بات کرتی، نہ ہنستی مسکراتی۔۔۔زندگی اسی طرح تمام سی ہوئے چلی جا رہی تھی۔ صحت پھر گرنے لگی تھی۔ ماں اپنی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر دل ہی دل میں پشیمان ہوتی رہتیں۔ آخر ایک دن انہوں نے دھوئی سے کہا کہ وہ روپی کو یقین میں لے کر، اُس کے کمرہ میں سو جایا کرے، تا کہ ایک سے دو ہوں گی تو اِدھر اُدھر کی باتوں میں مَن بَٹ جائے گا''۔ دھونی بھی اکیلی تھی۔ روئی کی یاد اُسے ستایا کرتی تھی۔ اُسے تو گویا بہانہ مل گیا۔

اُس نے اُسی دن روپی سے اِکا دُکا مرتبہ۔ اِدھر اُدھر کی، کچھ رمیا کی، کچھ راجو، کی اور کچھ تالاب کے متعلق باتیں کیں۔۔رمیا کا ذکر آتے ہی روپی نے اشتیاق سے پوچھا۔۔''کہاں ہے وہ۔۔آج کل۔۔'' کہ اتنے میں چچی وہاں آ گئیں، اور روپی خاموش ہو، کام میں لگ گئی۔

رات کو دھونی کوٹھری میں آ گئی۔اور رمیا کے متعلق روپی کو بتانے لگی کہ کیسے اُس کے پہلے پتی نے ایک ہزار روپے لے کر، دوسرے کے ناطے بٹھا دیا اور خود نے شہر میں کسی دوسری کو پھنسالیا''۔اپنی پیاری سہیلی کا چہرہ روپی کی آنکھوں میں گھوم گیا۔''نہ جانے کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی''۔۔لیکن اُسے یہ سب سن کر قطعی تعجب نہیں ہوا۔۔کیونکہ وہ جانتی تھی، ناطے بٹھانا، اُن کے یہاں عام بات ہے۔اسی طرح دونوں کچھ دیر یونہی باتیں کیا کرتیں، پھر دھوئی کے سو جانے کے بعد روپی اپنی پڑھائی کی طرف متوجہ ہوتی۔۔مستقبل کے متعلق سوچتی۔۔کیا کروں کیا نہ کروں۔۔کسے اپناؤں، کس چھوڑوں۔۔ترک وقبول کی بھول بھلیوں سے رات کو نہ جانے کون سے پہر نیند کا کھٹولا اُسے اُڑا لے جاتا۔

لیکن ایک ات ترک وقبول کا یہ تذبذب اُسے حویلی کے پھاٹک تک لے گیا۔

''کون ہے؟ کڑک دار آواز اور لٹھ کی جھنجھناہٹ نے اُس کا استقبال کیا۔اُس کا دل دھڑکا۔لیکن قدم بدستور آگے بڑھتے رہے۔اب وہ نندو رام کے روبرو تھی۔

''کیا کر رہی ہو بٹیا۔اس سمے کہاں جا رہی ہو۔۔آدھی رات کو۔۔

لیکن روپی نے کچھ نہیں سنا، بس روبوٹ کی طرح پھاٹک کی کھڑکی کھولنے کے لئے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا، نندورام نے شور مچاتے ہوئے کنڈی کو اس مضبوطی سے پکڑا کہ روپی آسانی سے کھول نہ سکے۔

''مجھے جانے دو۔۔کوئی نہ روکو۔۔ یہاں میرا دم گھٹ جائے گا۔۔ مجھے کیوں قید کر رکھا ہے۔۔ کیوں؟۔۔'' روپی دھاڑتی جا رہی تھی اور کنڈی پر لوٹی پڑی تھی کہ وہ کھل جائے کہ اتنے میں رتن سنگھ اور سدرشن سنگھ دوڑے دوڑے مردانے سے آگئے۔ دادی بھی ہوشیار ہوگئیں، لیکن اندھیرا ہونے کے سبب اٹھ نہ سکیں۔

''کیا ہوا نندو۔۔کون ہے؟ لٹھیت کہاں ہیں؟''۔

''کوئی نہیں مالک۔۔ یہ بٹو رانی، باہر جانے کی ضد کر رہی ہیں''۔

''روپ۔۔پی۔۔ بھلا اِس سمے''۔ سدرشن حیرت سے بڑبڑائے۔۔ رتن سنگھ تو مارے غصہ کے کانپنے لگے۔۔ فوراً بڑھ کر بیٹی کے بازو پر جھپٹا مارا اور اندر دھکیلنے کے لئے پکڑنے ہی والے تھے کہ روپی نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے آپ کو ان کی گرفت ہونے سے قبل بچا لیا۔۔ رتن سنگھ ہوا میں جھول گئے۔۔ غصہ اب پھُپھکار میں تبدیل ہوگیا۔ آنکھیں غیظ و غضب سے اُبلنے لگیں۔۔ لیکن روپی بھی شیرنی بنی ہوئی تھی۔

''باپو آگے نہ بڑھنا۔۔ میں وَیسک ہوچکی ہوں۔ آپ مجھ سے زبردستی نہیں کر سکتے۔ آج میں اس پنجرے کو توڑ دوں گی۔۔ دیکھتی ہوں کون روکتا ہے مجھے''۔ اس کی گرفت کنڈی پر مسلسل مضبوط ہو ہی رہی تھی کہ مرد کی جسمانی طاقت نے اپنا لوہا منوا لیا۔ رتن سنگھ نے بیٹی کو تو پھر ہاتھ نہیں لگایا البتہ کھڑکی کی کنڈی پر قبضہ ضرور جما لیا۔ سدرشن نے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوراً نرمی کا رُخ اختیار کیا اور بھتیجی کے قریب آکر بغاوت کی آگ کو پیار کی ٹھنڈک سے زائل کرنے کی سعی کرنے لگے۔

''بٹو۔۔ بھلا اس وقت آدھی رات میں کہاں جاؤ گی۔۔ سویرے جہاں تم کہو گی میں وہاں خود تمھیں

لے کر چلوں گا"۔

"نہیں چاہئے مجھے کسی کا بھی ساتھ۔ کیا بغیر پُرش کے اِستری کہیں آ جا نہیں سکتی۔۔ کیسا تماشا بنا رکھا ہے۔۔ آپ سب اندھیروں کے واسی ہو۔۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔۔ اُس نے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ جانے دو مجھے۔ ۔ میں اکیلی ہی بھلی۔۔ کیا سمجھ رکھا ہے مجھے۔۔ اولاد نہ ہوئی جاگیر ہو گئی۔۔۔ پھن پھیلائے بیٹھے رہتے ہو" روپی بضد تھی اور سدرشن اسے سمجھانے بجھانے میں لگے تھے کہ اتنے میں تعینات چار پانچ لٹھیت بھی وہاں آ گئے۔۔ اب جسمانی طاقت کے ساتھ حوصلوں کی بلندیوں کا مقابلہ تھا۔ شور سن کر سھدرا، رینو اور دھونی بھی زنانی ڈیوڑھی تک آ گئیں۔۔ روپ کنور سب سے لوہا لے رہی تھی۔۔ لٹھیتوں کو مالک کے اشارے کا انتظار تھا کہ اتنے میں کھڑکی کا دروازہ روپی نے کسی طرح کھول لیا پاؤں باہر نکالنے کے لئے اُس میں ڈالا ہی تھا کہ رتن سنگھ نے نندو رام سے آناً فاناً میں لٹھ چھین کر روپی کے سر پر دے مارا۔ لٹھ چلانا تو جانتے ہی تھے، معلوم تھا کہاں کتنی دبش دے کردار کرنا ہے۔ روپی کی آہ نکلی اور سھدرا کی چیخ۔۔۔ "ارے مار ڈالا میری بٹو کو"۔ سدرشن بھی بھونچکے رہ گئے۔ رتن سنگھ نے فوراً لٹھ کو ایک طرف پٹخا اور بے ہوش بٹی کو گود میں اُٹھا چل دیئے۔ اُس کی کوٹھری کی جانب۔۔ سب نے رات آنکھوں میں کاٹی۔ رتن سنگھ تو انگلیاں چٹخاتے، ہتھیلی سے ہتھیلی کو مسلتے، پاؤں کو جھٹکتے، پٹختے، صحن میں اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ہوتے رہے۔ صبح کے تقریباً چار پانچ بجے کے درمیان روپی کو ہوش آیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں لیکن ایک تو سر میں چکر تھے دوسرے بغاوت، نفرت اور کڑواہٹ سے بُرا حال تھا۔ اس لئے کڑوا کسیلا منہ بناتے ہوئے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔۔ خطرہ ٹل چکا تھا۔۔ چنانچہ سھدرا کو ضروری تاکید کر کے رتن سنگھ نے مردانے کا رُخ کیا۔ سدرشن بھی انہیں کے ہمراہ ہو لئے۔۔ دادی اور چچی بھی خفا خفا سی وہاں سے کھسک لیں۔ اب رہ گئیں سھدرا رانی اور دھونی۔۔ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔۔ پھر روپی پر اُن کی نظریں مرکوز ہو گئیں سھدرا کے ذہن کے دریچوں پر روپی کے کہے گئے الفاظ دندنانے لگے۔

''میں پوچھتی ہوں باپو! آخر کب تک ہم اس سسٹم کی بھینٹ چڑھتی رہیں گی۔ یہ تو کمیونسٹوں سے بھی بدتر ہے۔۔ ذہن، مشن، وژن۔۔ سب کا ناش کرنے والا۔۔ جیو کی ہرتیو تو نہیں ہو جاتی ہے باپو، ہاڑھ مانس کے لوتھڑے کو منشے نہیں کہتے۔۔ میں لوتھڑا نہیں بننا چاہتی۔۔ نہیں بننا چاہتی''۔

آہ۔۔ آہ۔۔ اوہ۔۔ مجھ جانے دو۔۔۔ جانے۔۔ د۔۔ د'' روپی زیر لب بدبدا رہی تھی اور سمدرا بے بسی کے عالم میں جیو سے لوتھڑا بنی اپنی بیٹی کی زندہ لاش کا ماتم منا رہی تھیں۔ کچھ دن تک روپی کی طبیعت بہت خراب رہی۔ دھونی نے اس کی جی جان سے تیمارداری کی۔۔ جب کچھ سنبھلی تو۔۔ ایک رات روپی نے دھونی سے پوچھا کہ ''روپی کہاں ہے۔۔ تمہارا تو یہاں کوئی رشتہ دار بھی نہیں، کیا اُس کی شادی کر دی ہے، نظر ہی نہیں آتی''۔ ایک ساتھ اتنے سوالات پر دھونی پہلے تو گھبرائی۔ پھر سنبھل کر بہانے بنانے لگی۔ لیکن روپی سمجھ گئی کہ وہ چھپا رہی ہے۔ بس پیچھے پڑ گئی اُس کے۔۔ آخر روپی کے بہت اصرار پر دھونی نے ایک ایک بات کھول کر رکھ دی۔ روتی جاتی تھی اور بتاتی جاتی تھی۔ جڑواں بہن تھی۔۔ تڑپ واجب تھی۔۔ اُس نے روپی کو بتایا کہ شروع میں تو وہ خود بھی روپی ہی کو قصوروار ٹھہراتی تھی، لیکن بعد میں غور کرنے پر اُسے محسوس ہوا کہ سارا قصور، اُس ابھاگن کا نہیں تھا۔ ''کاش، میں اپنی بہن کو لے کر کہیں نکل جاتی۔۔ رہ لیتیں ہم۔۔ جیسے تیسے محنت مزدوری کر کے۔۔ کم سے کم، یوں موت سے پہلے تو موت نہیں آتی''۔ وہ کہے جا رہی تھی اور روپی کو کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

''پتا جی، اور یہ حرکت''۔۔ نفرت و حقارت اور بے بسی کے کرب نے اُس پر رعشہ طاری کر دیا۔ دھونی نے اُسے سنبھالا۔ تو روپی نے سوال کیا۔

''دھونی تو جھوٹ تو نہیں بول رہی''۔

''نہ بائی سا! مہاری کا ہمت جو موں اونٹھ بوڑوں۔۔ تھے آپ ہس ماتا سری سے ہو چھ لو''۔

اگلی صبح، روپ کنور سیدھی اپنی ماں کے پاس گئی۔ روپی کے متعلق تفصیل جاننا چاہی۔۔ پہلے تو ماں نے اخلاقیات کا پاٹھ پڑھایا۔ لیکن بیٹی کے تیور دیکھے اور اتنے دنوں بعد اُسے بات

کرتے سُنا تو، ساری بات بتادی۔۔وہ خود بھی رودیں۔

''ماں، یہ گھور انیائے ہے۔آپ سب کورے آدرش وادی بنتے ہو۔۔میں جان گئی ہوں کہ اولاد تک کو جھوٹی شان کے لئے داؤ پر لگانے والے خود اندر سے کتنے کھوکھلے ہیں۔بڑے بڑے کانڈ کریں اور شرافت کا سوانگ، اس کلاکاری سے بھریں کہ، جیسے اِن سے بڑا پر ماتما کوئی اور ہوگا ہی نہیں۔۔ایسے لوگوں کی تو انتر اتما بھی نہیں ہوتی۔۔دِھکّار ہے مجھ پر، جو ایسے ماتا پتا کے گھر جنم لیا۔۔پرسُن لو ماں، میرا تو اب تک تم لوگوں نے جو حال کیا، وہ کیا۔۔پر اس کیس میں، میں تمہاری طرح چُپ بیٹھنے والی نہیں ہوں۔ایسے ڈھونگیوں کو تو سزا دلوا کر ہی رہوں گی''۔

''روپی، یہ کیا بک رہی ہے۔اب پھر کوئی نیا بکھڑا کھڑا مت کر دینا۔۔تیری وجہ سے پہلے ہی بہت بدنامی جھیل چکے، ہم''۔۔سھدرا نے اپنا رونا بھول، روپی کو ڈانٹا۔

''ماں جھوٹے آڈمبروں کے سہارے جیون کی نیا پار نہیں ہوتی۔۔ایک نہ ایک دن تو پاپ کا گھڑا بھرتا ہی ہے۔۔پھر کیوں نہ وہ میرے ہی ہاتھوں سے پھوٹے''۔۔مجھے تو اپنی پرواہ نہیں لیکن میں روتی کی آتما کو ضرور شانتی دلواؤں گی''۔روپی کا یہ نکھرا روپ دیکھ کر سھدرا رانی کو لگا جیسے ساکشات دُرگا ماں پرکٹ ہوگئی ہوں۔کچھ دیر کے لئے وہ انجام کا تصور کر کے سہم سی گئیں۔پھر سخت تاکید کرتے ہوئے کہا کہ۔

''اگر تو نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی کہ جس سے حویلی کی آن پر آنچ آئی تو روپی، قسم کرنی ماتا کی، مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔بچّی، اب تو ہمیں چین سے رہنے دے''۔روپی نے دیکھا۔ماں کی تاکید میں جتنا کرب پوشیدہ ہے، ان کے اَندرون میں اُس سے زائد طوفان کروٹیں لے رہا ہے، جس کی آہٹ روپی تو سن رہی ہے، لیکن وہ بے نیاز ہیں۔یا بنی ہوئی ہیں۔

ماں، بیٹی کے دو دن اسی تذبذب میں گزر گئے کہ وہ کیا کریں کیا نہ کریں۔۔آخر۔۔پہلا قدم سھدرا نے اٹھایا۔انہوں نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ دھوتی کا رات کو روپی کے پاس سونا بند کرا دیا۔۔دوسرے انہوں نے یہ بات اپنے شوہر تک کو نہیں بتائی کہ فضول میں پریشان ہوں

گے اور نہ جانے روپی کے ساتھ کیسا سلوک کریں۔۔لیکن خود نے اُسی دن سے بیٹی پر سخت نظر رکھنا شروع کردی۔۔حالانکہ انہیں معلوم تھا، حویلی کے دروازے کے بڑے بڑے کواڑں کو پھلانگنا، اتنا آسان نہیں۔۔اور وہ بھی اُس صورت میں جب کہ مَردانے کا زبردست پہرہ ہو۔کیونکہ بشن سنگھ، رتن سنگھ کو اب بھی ڈر تھا کہ قصبہ والے پھر کوئی فتنہ کھڑا نہ کردیں۔تجربہ نے انہیں انسان کی پرَکھ اور اس کا طوطے کی طرح آنکھ پھیر لینا۔دونوں عمل سے بخوبی آشنا کروادیا تھا۔انہیں اِنکشاف ہوگیا تھا کہ آپ کے ذریعے کیا گیا۔۔سب کچھ، دَھرا کا دَھرا رہ جاتا ہے اور رہ جاتی ہیں صرف۔۔انسان کے ذریعے انسان کو ذلیل کرنے کی سازشیں۔۔ایسے حالات میں چور تو سب سے زیادہ خوفزدہ رہتا ہے۔۔رتن سنگھ کا بھی کچھ یہی حال تھا۔

ایک ماہ گزر گیا۔۔سمدرا کو اطمینان ہوگیا تھا کہ روپی نے کوئی وِدرَوہ نہیں کیا۔۔وہ دل ہی دل میں اپنے بھگوان کا شکریہ ادا کرتی رہتیں۔۔لیکن روپی۔۔رات کی نیندیں تو اُس کی ویسے ہی حرام تھیں، دن کا چین بھی غارت ہوگیا۔ہر وقت یہی سوچتی رہتی کہ جس پاپ کے کنویں میں وہ قید ہے، وہاں دَلدَل کے سوا کچھ نہیں۔۔۔جس میں وہ دھنسی جا رہی ہے۔۔وہ چھٹپٹاتی ہے، نکلنے کی سعی بھی کرتی ہے تو۔۔دہکتے انگاروں جیسی آنکھیں اُسے گھورتی ہیں اور لمبے لمبے ناخونوں والے ہاتھ اُس کی گردن کی جانب بڑھنے لگتے ہیں۔۔بس روپی گھبرا کر راتوں کو اٹھ بیٹھتی اور کوٹھری کی چوکھٹ پر آکر، باقی رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دیتی۔

آخر ایک روز اس نے موقع دیکھ کر دھوتی کو ایک پرچہ تھمایا اور سخت ہدایت دی کہ کسی کو نہ دِکھائے۔سیدھے راجکمار کی مدد لے اور شہر کے پولس تھانے میں جاکر، یہ پرچہ وہاں دے دے۔۔دھوتی نے جب دریافت کرنا چاہا کہ اس میں لکھا کیا ہے تو روپی نے اتنا کہا۔۔

''اس سے ہمیں نیائے ملے گا۔بس تو اِتنا سمجھ اور یہ کام بڑی چترائی سے کرنا، مردانے کا پہرہ سخت ہے، ڈرنا بالکل نہیں۔۔۔میرے تیرے ساتھ ہوں''۔

دھوتی گنوار تو تھی ہی، کسی بھی صورت میں نیائے مل جائے، بس یہی چاہتی تھی۔اب

اُس میں کیا خطرات ہیں، کیسے اقدامات اُٹھ سکتے ہیں۔۔حالات کس حد تک ناساز گار ہو، قابو سے باہر جا سکتے ہیں۔۔۔اس سے اُسے نہ تو کوئی سروکار تھا اور نہ ہی اُس کی عقل اِن نتائج کی تہہ تک پہنچنے کی سَکت رکھتی تھی۔

دھونی نے مندر جانے کے بہانے سے حویلی کے باہر قدم رکھا۔ پرچے کو چولی میں ٹھونس، وہ سیدھی پہنچی راجکمار کے پاس۔۔روپی کا پیغام سُنایا۔ محبت اندھی تو ہوتی ہی ہے۔۔پھر روپی نے پہلی مرتبہ مدد مانگی تھی۔۔ بنا کسی چوں چرا کے، دھونی کو لے کر شہر روانہ ہوگیا۔۔ اور تھانے میں جا، پرچے کے ذریعے رتن سنگھ کے خلاف روپی کی طرف سے رپورٹ درج کروادی۔ اِدھر شام تک جب دھونی نہیں لوٹی تو سبھدرا کو شک ہوا۔انہوں نے بیٹی سے پوچھا تو اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔۔رتن سنگھ تک بات پہنچی۔۔ گُپ چُپ طریقے سے دھونی کی تلاش شروع کروادی گئی۔لیکن کوئی سُراغ نہ لگنے پر والدین کا قہر روپی پر اُترنے لگا۔۔روپی خاموشی سے ماں کی مار بھی برداشت کر رہی تھی اور باپ کی گالیاں بھی۔گھر کے دیگر افراد بھی اُسے بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔مگر وہ بالکل ساکت تھی۔۔سمندر کی اندرونی سطح کی طرح کہ جہاں گُھپ اندھیرے میں کوئی ہلچل نہیں ہوتی۔

جیسے ہی رپورٹ درج ہوئی۔پولس آناً فاناً حرکت میں آگئی۔معاملہ قتل کا جو تھا۔اور اُسی رات آدھمکی حویلی پر۔رتن سنگھ کا تو چہرہ فق ہوگیا۔بشن سنگھ نے سَر پکڑ لیا اور دیگر۔سب کے سب بڑے فکر منداور سہمے ہوئے کہ اب نہ جانے کیا ہوگا۔۔؟انسپکٹر نے رتن سنگھ سے پوچھ تاچھ کی۔ گھر کے تمام افراد کے بیانات ہوئے۔روپی نے تفصیل سے ساری بات بتائی۔۔۔باپ، بیٹی کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔لیکن اُسے پرواہ نہیں تھی۔۔ان تمام بیانات کے بعد چشم دید گواہ کے روپ میں جب دھونی کو جیپ سے اُتارا گیا تو۔۔پولس کی مخبر کی حیثیت سے،سب اُسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔۔رتن سنگھ نے سوچا۔

''اس میں اتنی بُدھی کہاں''۔ اب انہیں کامل یقین ہوگیا کہ ہو نہ ہو، یہ کام روپی کا ہی

ہے۔۔اُف۔۔گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے"۔۔انہوں نے دل میں سوچا اور بیٹی کی طرف بڑی بے بس نظروں سے دیکھا۔۔روپ کنور نے بے خوف ہو کر باپ سے نظریں ملائیں اور پولس بڑھ گئی، سوکھی باوڑی کی طرف۔۔رات میں ہی سرچ لائٹ اور ٹارچ کی مدد سے دھونی کے ذریعے بتائے گئے مقام کی کھدائی شروع ہوئی۔

کیسا زنانہ اور کیسا مردانہ۔۔۔کیسا پردہ اور کیسا حجاب۔۔گھر کے سبھی افراد، مع خواتین، وہیں جمع ہو گئے۔۔سب کے سب حیران، پریشان اور وحشت زدہ۔۔مگر روپ کنور اپنے موٹے بھدّے لباس میں اُس بیوہ کا روپ دھارے کھڑی تھی، جس کا منہ جھاڑ، سر پہاڑ تھا۔۔جس کی آنکھوں میں کوئی خواب نہ تھا، جس کی کلائیاں سُونی تھیں، جس کے پاؤں میں چپّل تک نہیں تھے۔۔چار مہینے میں وہ بوڑھی تائی نظر آنے لگی تھی۔

کھُدائی شروع ہو چکی تھی۔۔۔رات کے اندھیرے اور سناٹے میں قبر کی کھدائی، چمگادڑوں کی آوازیں، کبوتروں کی غُٹرغوں اور شکستہ دیواروں میں نصب دیوی دیوتاؤں کی مختلف انداز میں بوسیدہ مورتیاں۔۔اور۔۔گہری باوڑی کا پیندا۔۔اچھے اچھوں کی گھگّی بندھ جاتی۔۔۔لیکن یہاں تو سب کو اپنی پڑی تھی۔۔کسی کو حویلی کی آن بان شان کی۔۔کسی کو خاندانی وقار کی۔۔کسی کو عزّت آبرو کی۔

کھُدائی کرتے کرتے کھُدائی کا سِرا کسی چیز سے ٹکرایا اور اُلجھا۔۔کھَن۔۔کی آواز کے ساتھ دوسری طرف سے دھڑ ڑ، دھڑ ڑ کی متواتر تین چار آوازیں بھی آئیں۔۔سب چونکے، رونگٹے کھڑے ہو گئے۔۔آخر کانسٹبل نے ہمّت کر کے سرچ لائٹ پھینک کر پہلے اُن تین چار آوازوں کی طرف دیکھا۔۔کیا دیکھتا ہے کہ تین دیویوں کی مورتیاں دیوار سے نیچے آ گری ہیں۔۔کسی کا سر ٹوٹا ہوا تو کسی کا دھڑ۔۔اور باقی۔۔۔کھُدال کی مار کے ساتھ ہل جاتی ہیں۔۔اُسی کے ساتھ دوسرا کانسٹبل، جو کھُدائی کر رہا تھا۔۔۔اُس نے جھٹکا دے کر کھُدال کے سِرے کو باہر نکالا، تو دھونی کی چیخ نکل گئی۔۔۔بتیس لاکھ کے جوڑوں سے سجا، زنانہ استخواں ہاتھ کھٹ سے اُچھل کر باہر

آ گیا۔ قبر کو اور کھودا گیا۔ تقریباً بیس بائیس سال پُرانی زنانی لاش برآمد ہوئی۔ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ۔۔ پورے چونسٹھ چوڑے نکلے، جو لاش کے بھرپور سہاگن ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔

بشن سنگھ اور ماتیشوری کی نظریں آپس میں، کچھ دیر کے لئے ملیں اور جھک گئیں۔۔ روپی نے یہ بھی بھانپ لیا۔ ''اب معلوم ہوا، ہمیں اِس طرف کھیلنے سے کیوں منع کیا جاتا تھا''۔ کہ دوسرے کانسٹبل نے بھی انسپکٹر کو آواز لگائی۔۔ ''صاب، اِدھر بھی کچھ ہے''۔۔ دیکھا تو ایک لاش اور برآمد ہوئی۔ اُس کی کھوپڑی کھدال سے ٹکرائی تھی۔ اور ساتھ میں اُس پیالے نما کھوپڑی کو باہر کھینچ لائی تھی اور کھودنے پر اس کے اِردگرد سر میں لگانے کے رنگ برنگے زنگ آلود ہیئر پن بھی ملے۔ ظاہر ہے، یہ دوسری لاش تھی۔۔ اور اسی طرح بالکل تازی لاش روپی کی برآمد ہوئی۔۔ سب کی آنکھیں پھٹی تھیں۔۔ پولس والوں کو ان لوگوں کی جرأت و دلیری پر حیرت تھی، تو گھر والوں کو آنے والے خطرات کا اندازہ کر کے، دل حلق میں پھنستا محسوس ہو رہا تھا۔ اور روپ کنور، وہ تو بس، سب کو باری باری سے دیکھ کر اُن کی نفسیات کا اندازہ لگا رہی تھی۔ وہ بڑبڑائی۔۔۔

''ہونہہ۔۔ سب کے سب جھوٹے، پاپی۔۔ ڈھونگی۔۔۔ ایسے جیون سے تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا بہتر ہے۔۔ بڑی شان بگھارتے پھرتے ہیں۔۔ ہتیارے کہیں کے''۔ اُس نے سب پر حقارت سے نظر ڈالی۔

رتن سنگھ، بشن سنگھ کے تو کاٹو تو خون نہیں۔۔ وہ تو اپنوں سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ دونوں بیٹے، منجھلی بہو۔۔ سب کبھی اُنہیں دیکھتے، کبھی لاشوں کو، کبھی اُنہیں دیکھتے، کبھی لاشوں کو۔۔ دادی اور سبھدرا کی گردنیں بھی جھکی تھیں۔۔ پولس کاغذی کارروائی میں لگ گئی۔۔ اور باپ بیٹے کو ہتھ کڑی پہنادی گئی۔۔ کارروائی پوری کر کے، انہیں لے جانے والی ہی تھی کہ سبھدرا رانی دوڑی دوڑی، فریاد کرتی ہوئی آئیں۔۔ اور انسپکٹر کے قدموں میں ہاتھ میں لائی، زیورات کی پوٹلی انڈیلتے ہوئے، شوہر اور سُسر کو بخشنے کی گُہار کرنے لگیں۔۔ کوئی دو تین کلو سونے کے زیورات تھے۔۔ رات کے اندھیرے میں پوری آب و تاب کے ساتھ جھلملاتے، چمچماتے،، کھنکھناتے۔۔ انسپکٹر نے پہلے تو پرواہ نہیں کی، لیکن جب تینوں کانسٹبلوں کو، زیورات کو للچائی

نظروں سے تکتے ہوئے دیکھا تو۔۔۔اُس نے بھی توجہ کی۔۔۔بڑے بڑے نکلس،، بھاری جڑاؤ کنگن، کنکنیں (کنڈورے) بورلے، کنٹھیں، ٹھسیں، پازیبیں، انگھوٹھیں اور نہ جانے کیا کیا۔۔ساتھ ہی تصور میں آ گیا، بیوی کا ہنستا مسکراتا چہرہ۔۔۔خوشی میں ناچتا سراپا۔۔بس۔۔فرض اور لالچ میں جنگ شروع ہوگئی۔۔اور رات کا اندھیرا، مجرم مجرم موسے رے بھائی کا سبق پڑھا گیا۔۔۔پولس وہ لے گئی، جو نہیں لے جانا تھا۔۔۔وہ چھوڑ گئی جو نہیں چھوڑنا تھا۔۔دھونی کو تو لگا، اب چوتھی قبر اس کی ہوگی۔۔ اور روپ کنور۔۔۔وہ بڑے تمسخرانہ والے انداز میں ساری حرکتیں، سارے عمل دیکھ رہی تھی۔۔۔اچانک اس کی نظروں میں سب گندی نالی کے کیڑے مکوڑے بن گئے تھے۔۔ اور۔۔ ماں کا تصور؟۔۔وہ محفوظ آغوش، وہ سیرابی آنچل، وہ ممتا کا پیکر۔۔ذہن کے سمندر میں اب لپلپاتے ناگوں کی زہریلی پھنکار معلوم ہونے لگے۔۔ماضی وحال کی تمام شفقتیں، اس کی قوسِ قزح یکجا ہوکر فریبوں کے جال میں پھنس گئیں۔ لہولہان احساس نے رگوں میں خون کی جگہ اتنا زہر بھر دیا کہ۔۔۔منھ سے جھاگ نکلنے لگے۔۔ آنکھیں سرخ ہوگئیں، دانت بھینچ گئے۔رگیں تن گئیں۔۔اُس نے ماں پر حقارت سے نظر ڈالی اور فولادی عزم کے ساتھ کانپتی ہوئی دھونی کا ہاتھ پکڑا۔۔اور اپنی کوٹھری کی جانب طوفانی انداز سے بڑھ گئی۔۔وہاں جا کر اپنی کتابوں کا بنڈل باندھا اور پھر حیران و پریشان کھڑی دھونی کا ہاتھ دوبارہ پکڑ کر حویلی کے پھاٹک کو لانگھ گئی۔۔کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ اُسے روکیں یا ٹوکیں۔۔سبھدرا نے آگے بڑھ کر روکنا بھی چاہا۔۔لیکن شوہر اور سسر نے انہیں خاموشی سے انگلی کے اشارے سے منع کر دیا۔۔انہوں نے دونوں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا۔۔۔دونوں کے منھ سے ایک ساتھ ایک ہی بات نکلی۔۔

''اُسے جانے دو، جو ہوگا، اس کا ڈٹ کر سامنا کریں گے۔۔''

سبھدرا کو نہ تو اپنے کانوں پر یقین آیا، نہ آنکھوں پر۔۔۔اور بے ساختہ اُن کے ہاتھ جاتی ہوئی روپ کنور کو آشیرواد دینے کے لئے آسمان کی جانب اُٹھ گئے۔۔۔وہاں تارے

جگمگا رہے تھے۔ اور روپی، وہ شہر جانے والی سڑک پر دھوتی کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ رہی تھی۔ آج اماوسیہ کی اندھیری رات نہیں تھی بلکہ پورنما کا چمکتا چاند اپنی مکمل آب وتاب کے ساتھ دمک رہا تھا۔۔ تاروں نے فضا میں خُماری پیدا کر دی تھی۔ روپ کنور انہیں چاند ستاروں کی رہنمائی میں اُجیارے پگ کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔۔ اس بات سے بالکل بے خبر کہ چند قدموں کے فاصلے پر، اس کے پیچھے پیچھے راجکمار بھی چلا آ رہا ہے۔۔۔!!!

ثروت خان

21/جولائی 2005ء

(شام 7:40 پر)

انسانی سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں تاکہ ان میں واسنائیں زندہ ہونے نہ پائیں۔ اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ظلم پپتا اور دکھ اتفاقی نہیں بلکہ ایک ایسی آئیڈیولوجی کے پیدا کردہ ہیں جسے مذہبی اور تہذیبی طور پر سماج قبول کرتا ہے۔ یہی فاشزم کا معکوس روپ ہے۔ نہ جانے کتنی جوانیوں کو یہ اندھیری کال کوٹھری کھا گئی لیکن مصنفہ نے روشنی کی اس کرن کو دیکھ لیا ہے جو اندھیرے ہی کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ ثروت خان اپنی ناول کے لئے ایک ایسا بیانیہ اسلوب پانے میں کامیاب ہوئیں ہیں جو سبک رفتار ہے، اپنا ایک آہنگ رکھتا ہے اور حقیقت نگاری کے شعلوں کے ساتھ ساتھ نازک اور لطیف جذبات کی شبنم اور گاہ گاہ ہلکی جذباتیت کی مہین دھند کو بھی اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے۔ عموماً تازہ واردانِ ادب کی پہلی افسانوی کوشش اپنی ہی زندگی کی سہانی یادوں یا رومانی تجربات پر مبنی ہوتی ہیں لیکن ثروت خان نے ایک سماجی موضوع کا انتخاب کر کے آئندہ اپنے اسپ قلم کے لئے وسیع تر انسانی تجربات کی جولانگاہیں منسوب کر لی ہیں۔

پروفیسر وارث علوی